۲۵ نظمیں

ایک نظریہ ایک تجربہ

ڈاکٹر سید محمد صدرالدین فضا شمسی

ایم۔اے ٹرپیل ڈی لٹ

۲۵ نظمیں - ایک نظریہ ایک تجربہ

ڈاکٹر سید محمد صدر الدین فضا شمسی (علیگ)
ایم اے ٹرپل ڈی لٹ
صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج پٹنہ ۵

LIB ACADEMY

کتاب منزل - سبزی باغ - پٹنہ ۴

بھی ان کے دل میں ہر طرح بسی ہوئی ہے۔ وہ اپنے اشعار کی مالا لے کر اس کے حضور میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں "میرے خیال کے کہسار کون دیکھے گا۔ مری بلندی رخشاں پہ کون آئے گا"۔ یہ پوری نظم اسی خیال کے کہسار اور بلندی رخشاں کی مختلف تصویریں اور متنوع تفسیریں ہیں جن میں حیرت زائی ہے۔ عبرت انگیزی ہے اور حسن آرائی اور یہی کمال شعر بھی ہے۔ ایسے اشعار کہنے والا شاعر، شاہین کا جگر کہتا ہے۔ خوددار و خودشناس، وہ عام انسانی سطح سے بلند ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اقبال کی روح سے مخاطب ہے اور مدد کا خواہاں ـــ دوسرے اور تیسرے ٹکڑے میں وہ محبوبِ شاعر کا محبوب شاعر سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا گرچہ زرنگار اور پُربہار ہے مگر یہ گندم نما جو فروشوں کی دنیا ہے:۔

اب آؤ چھوڑ و چکوروں کی زرد رو دنیا
یہ جو فروشوں کی چھوڑو بھی گندمی دنیا

اپنے محبوب کو یاد کر کے شاعر اس آسودگی کو یاد کرتا ہے، جو اسے میسّر تھی وہ پھر اس آسودگی کی تلاش میں ہے۔ شاید اسی آسودگی گم گشتہ کی تلاش نے اقبال سے یہ کہلوایا تھا:

حضورِ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اپنے خیال کے کہسار اپنے محبوب کو شاعر دکھانا چاہتا ہے اور اس کی بلندی تخیل اس کو شاعری کی ہر وادی میں لے جاتی ہے۔ اس طرح وہ زمین سے آسمان تک خیالات کی ایک زنجیر بنا دیتا ہے۔

انگریزی کی ایک نظم (The Three mirrors) دی تھری مررس جو اڈون میور (Edwin Muir) کی لکھی ہوئی ہے، شاید یہ نظم اسی نظم کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس انگریزی نظم میں تین اسٹینرے ہیں، جو تین آئینوں کا راز بتاتے ہیں۔ یہاں بھی پہلا آئینہ حضرت موسیٰ کے دور قہر و جبر کا عکس ریز ہے۔ بیان مختصر ہے، مگر جامع، انداز بھی رعب پرور ہے، الفاظ بھی خشمگیں انداز کے ہیں۔ یہ غیض و غضب، ہر مظہر قدرت اور ہر ذرہ حیات پر ہے، زندوں پر ہے مردوں پر ہے، میدانوں پر ہے، شاہراہوں پر ہے، در و دیوار پر ہے، کونہ کونہ پر ہے، ہر راہ پر ہے، قریوں پر ہے، دیہاتوں پر ہے، غرض انسان اپنے جبر و تشدد کا اثر ہر جگہ ڈال چکا:-

The mountain summits were sealed
In incomprehensible wrath
The hunting roads ran on

To round thy flying hill

The walls were as kew with ill
As kew went every path
The dead lay askew in the tomb

کلیم صاحب نے پہلے آئینہ کی عکس ریزی میں موسوی دور سے پہلے کی تصویر بھی دکھائی ہے اور وقفہ دے کر یہ بتا دیا ہے کہ انسان نے اپنی دہشت پسند حرکات سے کس طرح اس آئینہ کو زنگ آلود کر دیا ہے کہ اب اس میں صرف

قہر و غضب کے شعلے ہی ناچتے دکھائی پڑ رہے ہیں۔ میور نے اپنی نظم میں ٹھوس حقیقتوں پر قہر کا رنگ چڑھا ہوا دکھایا ہے۔ میور نے خون کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن کلیم صاحب نے خون کا ذکر متعدد مصرعوں میں کیا ہے۔ شاید ان کے ذہن میں اپنے ماحول کا خوں ریز سماں بھٹک رہا ہے:

کیسی وحشت کی حکومت ہے یہاں
کیسی دہشت کی حکومت ہے یہاں
یہ تشدّد کے علم کیسے ہیں
جبر کیوں، ظلم و ستم کیسے ہیں

دوسرے آئینہ کا رُخ دکھانے میں کلیم صاحب نے کچھ زیادہ فہم و بصیرت سے کام لیا ہے، میور کہتا ہے:

I looked in the second glass
And saw through the twisted scroll

آئینہ کا یہ رخ ان دو مصرعوں سے متعیّن ہوتا ہے:

And new in eternity
Father and mother and child

مگر کلیم صاحب نے اس تجربہ کی بے ساختگی اور بنیادی ضرورت کو دکھایا ہے:

اس نے ظلمت سے جو کاڑھا ہے نور
ظلم سے رحم کا ہوتا ہے ظہور

ظلم سے رحم کا ظہور یہ ہے وہ نادر خیال جو میور کے پلّے نہ پڑ سکا

ہاں اس نے اس آئینہ کی نشاندہی کر دی ہے۔ مگر کلیم صاحب اس میں بھی اشارات ہی سے کام لیتے رہے، ظلمت سے نور کا کاڑھا جانا میر کی بدولت عام ہوا ہے۔ رحم و رحمت کے فدائیوں نے پھر غیض و قہر کا چولا پہن لیا، اس کو میور اس طرح بیان کرتا ہے:

But in the little blade and leaf
By an angry law were bent
To shapes of terror and grief

کلیم صاحب نے اس رنگ کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا ہے:

لو! اسی رحم سے تلوار بنی
جان لیوا یہ ستمگار بنی
جنگجو مائلِ پیکار بنی
خون پی کر یہی خونخوار بنی
اشہبِ خوں کو ہوئی کیا مہمیز
دشت و دریا ہوئے خوں سے لبریز

میور نے اجمال پیش کی تھی۔ اشعار مندرجہ بالا اس کی تفصیل ہیں اور اسی لئے مشرقی انداز فکر کے مناسب ہیں اور ہم پر گہرا اثر ڈالتے ہیں:

The child at peace in his play
Changed as he passed through the door
Changed were the house and the tree
Changed the dead in the knoll

یہاں لفظ چائلڈ (Child) پر غور کیجئے اور پھر یہ مصرعے پڑھئے:

جو تھا غفّار، وہ جبّار بنا
جو تھا منّان، وہ قہّار بنا
لب پہ الفت کا فسانہ خنداں
خوں چکا ہاتھوں سے ہے خونِ رواں

First locked in love and grief
Good with evil lay

اس کے ساتھ ساتھ یہ پڑھئے:

یہ چمن اب ہے محبت کا چمن
رحم کے نور سے روشن روشن

تیسرے آئینہ میں مبور بھی محض اشاروں پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ یہ تینوں آئینے اس کے یہاں الگ الگ ہیں، جو بالقصد بنائے گئے ہیں، مگر کلیم صاحب نے ان تینوں آئینوں کو سلسلۂ کائنات کی تین کڑیوں کی طرح پیش کیا ہے۔ ایک آئینہ کام نہیں کرتا ہے، تو اسی آئینہ سے دوسرا آئینہ ابھرتا ہے، یہ انداز دلچسپ بھی ہے اور حقیقت سے قریب بھی اور شاعر کی قوت تعمیر کا مظہر بھی۔ مبور کے یہاں تینوں ٹکڑے مل کر مکمل اکائی سامنے نہیں لاتے۔ کلیم صاحب نے اس تثلیث کو وحدت منظم بنا کر پیش کیا ہے۔ اور انسانیت کے لئے ہر دور میں عبرت کا آئینہ فراہم کر دیا ہے، ممکن ہے یہ تجربہ دوسرے کا ہو۔ لیکن کلیم صاحب کے انداز فکر نے اس کو ان کا اپنا تجربہ بنا دیا ہے:

If I looked in the third Glass
I should see evil and good
Standing side by side
In the ever standing wood

ذرا ان مصرعوں کو پڑھئے :

دست تدبیر میں تقدیر ہے آج
شر کے پہلو میں یہاں خیر ہے آج

The wise king safe on his throne
The rebel raising the rout
And each so deeply grown
Into his own Place

اور اب پڑھئے :-

کیسے ہمدم یہ بنے بیٹھے ہیں
شاتوں سے شانے ملے بیٹھے ہیں
بادشہ تخت پہ بیٹھا ہے یہاں
تاج الماس ہے رخشاں رخشاں
کیسی محکم ہے حکومت کی زمام
عدل و انصاف کا پھیلا ہے نظام
انقلابی بھی ہیں، باغی بھی ہیں
اور بدمست شرابی بھی ہیں

کلیم صاحب کے یہاں تدبیر، تقدیر، تاج، الماس، انقلابی، باغی یہ سب

اصطلاحات مشرقی سرزمین کا اثر معلوم ہوتے ہیں، اسی لئے آئینہ کے اس عکس کو ذرا وضاحت کے ساتھ روشن کیا ہے :

If I could look I should see
The world's house open wide
the million million rooms
And the quick god every where
glowing at work and at rest

دست قدرت کا ہنر کھلتا ہے
بند جو در تھا وہ در کھلتا ہے
لاکھوں کمرے یہ سجے ہیں کیسے
روشن آئینے لگے ہیں کیسے
کیسے ساغر ہیں یہ سیمیں سیمیں
مئے صد رنگ سے رنگیں رنگیں
ساز محنت بھی ہے آرام بھی ہے
دلستاں بھی ہے دل آرام بھی ہے

Tranquillity in the air
Peace of the humming looms
Weaving from east to west
And you and myself there

شرق تا غرب سکوں ہے رقصاں
درد دل کا ہے سکوں اب درماں

یسور کے اس آخری مصرع کو پڑھئے اور پھر نظم مذکورہ کا ابتدائی حصّہ پڑھئے، کون مخاطب ہے اور کیوں مخاطب ہے اور اس مخاطبت سے کیا اثر پیدا کرنا ہے، ظاہر ہو جاتا ہے:

آؤ آرائش کاکل نہ کرو
زلف پُرخم کو ذرا خم نہ کرو

یہاں اقبال کی فرمائش کے خلاف فطرتِ یزداں سے فرمائش ہے۔ وہ کہتے ہیں "یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را" مگر کلیم صاحب یہ کہتے ہیں کہ نہیں، انھی اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے، اس لئے کہ:

حسن کو اپنے تماشا نہ کرو
تم فسانہ ہو فسانہ نہ بنو

معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ نظم، نظم کی ساری ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے اور شاعری کا ایک کامیاب نمونہ سامنے لاتی ہے۔ اس میں تجربہ بھی ہے اور جذبہ بھی، جذبہ تجربہ ہے، تجربہ جذبہ ہے، تجربہ شعر ہے، شعر تجربہ ہے۔ یہ ہم آہنگی اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ الفاظ اپنے ہیں، سجل ہیں، ناگزیر ہیں اور معنوں کی طرف براہ راست رہبری کرتے ہیں، پہلے آئینہ کے عکس جمالی میں منظر نگاری کا کامیاب مرقع ہے۔ کلیم صاحب نے اس سلسلہ میں متعدد مقامات پر اپنی فطرت پسندی کا اظہار کیا ہے، ان کو نیچر کا شاعر تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں نیچر سے اپنی شاعری کے

ہنر یہ ضرور حاصل کرتے ہیں -

---

(۱۳) اس چھوٹی سی نظم میں خالق و مخلوق کے رشتہ کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی، خالق و مخلوق کے باہمی رشتے عشق و محبت کے تاروں میں گندھے ہوئے ہیں - انسان جب سے پیدا ہوا ہے، وہ اپنے بنانے والے کو قریب سے قریب دیکھنا چاہتا ہے - اگر آدم خدا کی قربت کا پختہ احساس رکھتے کہ وہ ہماری رگِ گردن سے بھی قریب ہے، تو شاید آدمیت کی تقصیر ان سے سرزد نہ ہوتی جب آدم فرشِ زمین آباد کرنے لگے، تو اس دوری کا احساس تند و تیز ہوتا گیا - یہاں تک وہ دل رُبا ہر طرح گم ہو گیا - انسان کا اپنا وجود ہی اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی بنانے والا اس کا ہے، اسی خیال نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنے خالق کی تلاش میں پریشان و حیران کر دیا تھا - انھوں نے ستاروں کو دیکھا، ان کی چمک دمک اور ان کی کشش دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی محیر العقل ہستی خالق کائنات ہے، مگر جب تاروں کو ٹوٹتے دیکھا، گھبرا گئے - انھوں نے ماہتاب کو دیکھا، اس کی آن بان اور معبودی شان دیکھ کر بول اٹھے کہ یہی تو ہمارا معبود ہے، مگر چاند کی روشنی عارضی تھی، دوسرے کی دی ہوئی، وہ روشنی ختم ہو گئی اور ادھر ان کا عقیدہ بھی ختم ہو گیا - اب انھوں نے آفتاب کو تاکا، یہ نور کا مجسمہ، آفتاب سرمدی درخشانی و عظمت رکھنے والی ہستی، خالق کائنات ضرور ہو گی، فَلَمَّا اَفَلَ، قَالَ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو بول اٹھے میں غائب ہو جانے والے کو دوست نہیں رکھتا)

اسی طرح کا خیال اس نظم میں بھی ملتا ہے - شاعر اپنے دل رُبا کو دیکھنا چاہتا ہے -

اور اس کی تلاش میں سرگرداں بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر زندگی ویران ہے، چمن غیر آباد ہیں، پانی کے چشمے خشک پڑے ہیں اور یہ رنگ و بُو کی دنیا سونی سونی سی ہو گئی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک حساس دل، دنیا کی تباہی اور دنیا والوں کی عیاری کو دیکھ کر دل مسوس کر کے رہ جاتا ہے۔ وہ خدا کو کھوجتا ہے کہ انسان کا مایوس انسان کا آخری سہارا خدا ہے:

اے دل میں آنے والے
نظروں سے کیوں نہاں ہے

یہی ہے اس نظم کا مرکزِ ثقل، اور اسی تجسّس نے شاعر کو چند نادر تجربات عطا کئے، یہ تجربات عامی ہیں، عمومی ہیں۔ لیکن ان سے نتائج اخذ کرنے کی توفیق سبھی کو نہیں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یّشاء (یہ تو اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے وہ عطا کرے)۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ کے تجربے کو ذرا پھیلا کر، متمدّن دنیا کے مطابق سائنٹیفک بنا کر پیش کیا گیا ہے، مگر اس کا فطری پن اپنے رفیق سفر سے سوال کرنے کے باعث کچھ مجروح ہو جاتا ہے۔

اہلِ نظر سے پوچھا
وہ دل رُبا کہاں ہے

جواب، تو کافی و شافی مل گیا، جواب اتنا خلاف توقع تھا کہ اس کی جستجو کو اور بھی حیلہ جستجو ہاتھ آ گیا۔ چمن کا رخ کیا۔ گلوں کے کٹورے میں شبنم کے موتی دیکھ کر، اس زمین کے ہیرے کو، آسمان کے تارے کو وہ اٹھا لینا چاہتا ہے۔ عالم اضطرار میں دل نے کہا اٹھا لو۔ مگر وہ پگھلے ہوئے ہیرے تھے، پانی کی طرح بہہ گئے، کچھ ہاتھ نہ آیا، صرف اُنگلیاں بھیگ کے رہ گئیں، یہ کیسا سچّا تجربہ ہے،

ہیں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص نے اس کا تجربہ کیا ہے، انگلی بھیگ جانے سے استعارہ ہے کہ وہ ذات ہے ہم سے قریب ضرور، مگر اس طرح قابو میں آنے والی نہیں، یہ اوتا وَلاپن ٹھیک نہیں۔ وہ آگے بڑھا، کلیوں کو دیکھا، پھولوں کے جال بچھے ہوئے تھے، رنگ رنگ کے پھول زینت نظر بنے، ایسے ایسے معطر خوشبو پھول جن کی مہک سے خود کلیوں کا دماغ بھی مہک رہا تھا، شاعر کی جان تک معطر ہو گئی، یہاں پھر اشارہ ہے کہ اب وہ دل ربا اور قریب ہو رہا ہے۔ مگر صبح ہوتے ہی بیباک کرنوں نے ان کو اس طرح گھورا اور باد صبا نے کچھ انداز سے گدگدایا کہ کلیاں مرجھا گئیں اور ان کی لطافت ختم ہو گئی، انسان پر ایسا وقت آتا رہتا ہے، جب وہ اپنے خالق سے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن تہذیب و تمدن کے طوفان اس کے احساس و عقائد کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور پھر فطری انکار کی آگ ایسے شواہد کو جھلس کے رکھ دیتی ہے۔ اب وہ مایوس ہو کر دریا کی طرف چلا قطروں سے دریافت کیا، قطرے فرط مسرت سے اچھل اچھل کے اس کے ہاتھوں پہ آنے لگے۔ یہ بتلانے لگے کہ وہ دلربا ان قطروں ہی میں پوشیدہ ہے۔ لیکن آفتاب کو یہ شوخی یہ دہ دری پسند نہ آئی اور اس نے اپنی روشنی کے تیر سے قطروں کے وجود کو ختم کر دیا، دکھلا دیا کہ قطرہ بھی فانی ہی ہے۔ اس لئے اس سیل زندگی میں وہ دلربا کہاں ہے۔

زمین نے جب اس کو پتہ نہ دیا، تو وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے (حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے ماحول سے ناآسودہ ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑے بُت کو توڑ ڈالا اور کسی نے بھی ان کو سزا نہ دی، جس سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ معبودان باطل ہیں) ــــ شاعر آسمان کے تاروں کی نورانی و نورانی قطار

اس نظم میں محبوب کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے روٹھے ہوئے دوست کو منانے کے لئے کچھ منظر نگاری سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس میں نظیر کی منظر نگاری ہے۔ مجاز کی الفاظ کی فراوانی ہے، انیس کی مصوری ہے، دبیر کی شوکت ہے۔ حالی کی سادگی ہے اور اقبال کی معنویت۔ ان مختلف عناصر سے ایک گلدستہ بنایا گیا ہے، جو حسین بھی ہے، مہیب بھی، شاعر عام سطح سے بلند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی خدائی کا تماشا دیکھنا ہے، تو انسان ذرا اوپر کو اٹھے، وہاں سے جھانکے اور دیکھے کہ خدائے قدوس نے کیسے کیسے مناظر اس کے سکونِ خاطر کے لئے پیدا کئے ہیں۔ یہاں زندہ رہنے کے لئے شور طوفان اور خطروں کے نشان سے ڈرنا نہ ہوگا مگر جب انسان، نادان انسان فطرت کی ان فیاضیوں سے بہرہ ور نہیں ہوتا، تو فطرت اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتی ہے۔ جس سے ہر شئے منقلب اور خوفناک معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ سارے مناظر زبان حال سے اپنی بے مائگی ظاہر کر رہے ہیں اور یہ بتلا رہے ہیں کہ انسان یہ کم مایہ انسان آج بھی اپنے دامن میں سکون سمیٹ سکتا ہے۔ چاریار کی سازش کا گھر یہ سہم انسان آج بھی ایسی روح رکھتا ہے، جو خدا کو آواز دے اور خدائی کو شرما دے۔ اسے ابھی سکون کی ضرورت ہے، اسے اس فساد آباد کو دارامان اور دارالسلام بنا کر دکھانا ہے۔ ہندوستان کے مادی طوفان سے امن انسان اور آدمیت انسان درہم برہم ہوئی جاتی ہے۔ حالانکہ کبھی یہی ملک امن و سکون کا گہوارہ رہ چکا ہے:

یہ میں نے دیکھا۔ سنو دیکھو میں نے کیا دیکھا
کہ ان کے دل میں سکوں لے رہا ہے انگڑائی

میں سے چند تاروں کو توڑتا ہے۔ اس کی درخشانی اور اس کی معصومی حسن سے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا دل رُبا ضرور انہی تاروں میں چھپا ہوا ہے لیکن جلد ہی تارے ٹوٹ کے زمین پر گر پڑے، شاید یہ بتانے کے لئے کہ اس دل ربا کا بھید وہی جانتا ہے، جو اس کا اہل ہو، تارے شرم و خوف سے ٹوٹ کے گر پڑے، مبادا اس کا راز منکشف ہو جائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پردہ یہ پردہ نہاں ہے اور وہ پردہ نشیں کسی شے میں جلوہ گر نہیں ہو سکتا، ورنہ پردہ باقی کیسے رہ سکتا ہے ؎

رہتے ہیں خیالوں میں نگاہوں میں دلوں میں ٭ اس پر بھی یہ دعویٰ ہے کہ ہم پردہ نشیں ہیں

اس دلربا کو ہر شئے میں پیدا و پنہاں مان کر انسان نے دل بہلانے کا سامان پیدا کیا ہے کہ اس کو ایک سہارا چاہیئے اور خدا ہی آخری سہارا ہے : ؎

ظاہر میں کہیں رہتے ہیں، باطن میں کہیں ہیں ٭ یہ وصف انھی میں ہے کہ ہیں اور نہیں ہیں

آخر میں یہ راز کھُلا : ؎

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرّے ٭ جس کی خاطر تجھے تکا پو ہے

وہ دلربا، دل میں جلوہ آرا ہے، اس کے لئے نہ زمین چھاننے کی ضرورت ہے، نہ آسمان ناپنے کی، کسی کی کیا مجال کہ اس کو اپنے یہاں جگہ دے سکے یہ تو انسان کے دل ہی کا ظرف ہے، جس نے اپنی اہلیت ثابت کر دی ہے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے ٭ میرا ہی دل وہ ہے کہ جہاں تو سما سکے

اسی دل گداز کی وجہ سے انسان بار امانت اٹھانے کا متحمل ہوا۔ یہ

بار امانت کیا ہے، سوچیے۔

دل ہی میں اس کو ڈھونڈو
یہ دل ہے اس کی محفل
مسند پہ دل کی دیکھو
وہ شاہ دلنشیں ہے
عرش بریں یہیں ہے
کون و مکاں یہیں ہے
اور لامکاں یہیں ہے

اب جو شاعر اپنے دل کو دیکھتا ہے، تو واقعی وہ ایک بقعہ نور بنا ہوا ہے، نور سرمدی کے چمن کھلے ہوئے ہیں، کتنے بدر و ہلال آس پاس چمک رہے ہیں — سچ ہے، وہ دلربا اسی نور کے مامن میں ہے۔

انسان بالطبع حریص ہوا ہے، اس کا دل دنیا کے مہ اور مایا میں پھنس جاتا ہے اور یہی مسند دلربا رفتہ رفتہ اتنا کثیف ہو جاتا ہے کہ اب اس کو نور دیکھنے میں بھی نہیں آتا۔ چار عناصر کی شوریختی کیجیے کہ ہر چہار طرف جبر، تشدد اور تمرد کا طوفان آیا ہوا ہے۔ انسان نے اپنی خلافت کو برقرار نہیں رکھا، اس کلجگ کا انسان وحشت و بربریت کی طرف لوٹ گیا، ظلم و ستم اس کا شعار بن گیا، خوں ریزی اس کا وتیرہ —— اب دل ویسا ہی تاریک ہو گیا ہے جیسا پہلے تھا — یہ ہے انداز انسان کی محرومی ظاہر کرنے کا، بات کہاں سے کہاں نکل آئی اور ایک تنگ دائرہ سے شروع ہو کر وسعت کائنات پر چھا گئی۔ ہر انسان کا یہی حربہ ہے، وہ انسان کہیں کا بھی ہو، کسی مذہب کا ماننے والا

ہو۔ وہ پہلے انسان ہے اور اگر وہ انسان بن جائے، تو سب کچھ بن سکتا ہے۔
خداوند قدوس اپنے مسکن کو، اپنے منوش بریں کو اس طرح تیرہ و تار دیکھ کر پریشانی کا اظہار کرتا ہے:

مجنوں یہ کون نکلا
جو مجھ کو ڈھونڈتا ہے
ذوق جنوں کو اس کے
حیرت سے تک رہا ہوں

میں نے اس کی تسکین کے لئے کیا کیا نہ کئے، کلیاں کھلائیں، باغ لگائے، تارے بنائے، ان چاند تاروں سے آگے کتنی دنیائیں بنائیں، زمین دیئے آسمان دیئے اور زرتار خلائیں دیں، مگر اس کی ناآسودہ فطرت آسودہ نہ ہو سکی اور دل کسی پہلو مطمئن نہ ہوا، وہ برابر اپنے حال سے بیزار رہا، مستقبل سے غافل اور ماضی سے متنفر، اس کی اس بے حسی سے میں تو مایوس ہو چلا ہوں۔ اور بار بار یہی ذہن میں آتا ہے، کیا میں خدا ان کا نہیں ہوں:

مجھ کو خبر نہیں ہے
میں کون ہوں میں کیا ہوں

میں نے دل بنا کر اس کو اپنا تخت بنایا، اس طرح اپنے وجود کا معمہ حل کر دیا، مگر دل والوں نے اس تخت کو توڑ دیا۔ اس کے نور پر ظلمت و کثافت کی تہیں جما دیں، — یہ آئینہ بار بار ٹوٹ گیا ہے۔ مگر انھی بکھرے ہوئے ٹکڑوں سے پھر آئینہ بنانا ہوگا کہ زندگی کا یہی تقاضا ہے، ایک آرزو ہے، ایک جستجو ہے، — انسان زندہ رہے، اور میں بھی زندہ ہوں، اس لئے اب

ہم دونوں ایک دوسرے کو تلاش کریں:

شیشوں کو مرے چُن لے
آئینہ پھر بنا دے
تو کھوج، میں بھی کھوجوں
اپنا پتہ لگاؤں
میں کون ہوں میں کیا ہوں

یہی ہے انسان کی تیرہ بختی جس کو کسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے:

شکوہ ہے اپنی نارسائی کا ترا شکوہ نہیں ٭ نکلے تلاشِ یار میں گم کر دیا اپنا صنم

اس نظم میں ۱۸۰ مصرعے ہیں۔ مصرع کا ہے کو، اتنی ساری نکیلی سوئیاں ہیں، جو انسان غافل انسان کو چبھو چبھو کر بیدار کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔

---

(۱۴) ۱۶۰ مصرعوں کی اس چھوٹی سی نظم میں انسان کی ایک محروم انسان کی نفسیاتی تحلیل ہے، زبان شاعر کی بہت سیدھی ہے اور کوئی بیان پیچیدہ نہیں، سادگی اور وضاحت اس کا زیور ہے، لیکن وضاحت اور سادگی کے باوجود چونکہ یہ نظم باطنی کشمکش کو بتاتی ہے۔ اس لئے معنوں پر ایک طرح کی تہہ جم گئی ہے۔ جس نے شاعری کا لطف برقرار رکھ دیا۔ آج کل بات بات میں شعور، لاشعور اور تحت شعور کی باتیں درمیان آجاتی ہیں اور ہر الجھاؤ کو لوگ نفسیاتی گرہ کشائی بنا بیٹھے ہیں۔ لیکن اس نظم میں واقعی ایک نفسیاتی ردعمل کا بیان ہے۔ پیرایہ بیان شاعرانہ ہے، اس لئے یہ نفسیاتی کشاکش

سراسر فلسفہ کی چیز نہ ہو کے روح کے اہتزاز کا باعث بن گئی ہے۔ کلیم صاحب نے بار بار کہا ہے کہ کسی ایک شاعر کے بس کی بات نہیں کہ وہ دنیا کے سارے مشاہدات حاصل کر سکے، ہر طرح کے تجربات اور مختلف احساسات کا اس کو موقع کہاں مل سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس تجربہ کو شاعر بیان کر رہا ہے اس میں خلوص کی آنچ کس حد تک دی گئی ہے، وہ تخیئلی تجربہ کو کس حد تک واقعاتی تجربہ بنا سکا ہے۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے دلوں میں جتنی اور جس طرح کی بھی خواہشیں، آرزوئیں اور امنگیں ابھرتی ہیں، ان کا آسودہ ہونا اور ان کی تکمیل انسان کی صحت و بقا کے لئے ضروری ہے بعض تجربات ایسے بھی ہوتے ہیں، جو تہذیب و تمدن کے خوف سے، ملامت گروں کی ملامت کے ڈر سے، اپنے بیگانے کی انگشت نمائی سے بچنے کے لئے، ہم غیر مکمل چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی تسکین نہیں کر پاتے۔ اب اگر یہی ناآسودہ خواہشیں، اور ناآزمودہ تجربے کسی طرح دوسری راہ پر لگ گئے اور ان سے کوئی اچھا کام لیا جا سکا، تو وہ خواہشیں دوسرا روپ دھار کر ختم ہو جاتی ہیں اور وہ انسان آسودہ و مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر یہی ارمان تشنہ کام رہے اور انھیں ظاہر ہونے کے ہر موقع پر پہرے بٹھا دیئے گئے، تو انسان بوکھلا جاتا ہے۔ وہ اعصاب شکستگی کا شکار ہو جاتا ہے، وہ دیوانہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ سماجی پابندیاں اس کی زبان پر مُہر بن گئی ہیں اور پاؤں میں بیڑی، نہ کہہ سکتا ہے نہ کوئی جد و جہد کا راستہ پا سکتا ہے، انجام کار وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ اس پاگل پن کے علاج کے لئے کوئی علاج گاہ نہیں ہے، اسے کان نکیل کھینچنے کی ضرورت نہیں، وہ علاج بالمثل چاہتا ہے، اس کی تکلیفوں کو پیار سے سنئے اور اسے

اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دیجئے، ایک بار نہیں متواتر اس کو اس کا احساس دلایا جائے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے، اس کو کوئی خوف نہیں، اپنے دل کی بات بے دھڑک کہہ سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا جنون ختم ہو جائے گا اور اپنی اصلی حالت پر خود کر آئے گا۔

یہاں اسی طرح کے ایک ناآسودہ شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے اس کو نیند میں کوئی صورت دکھائی دیتی ہے:

یہ دیکھو خواب کی دنیا میں کون آیا ہے
یہ چاند ہے کہ ستارہ ہے برق ہے کیا ہے

خواب آتے ہی اس کے سامنے کسی کی صورت، (اس کے محبوب کی تصویر) سامنے آکر طرح طرح سے اظہار فریفتگی کرتی ہے۔ اس کو پیار کرتی ہے اور ہنس ہنس کے ہنساتی ہے۔ مگر جب وہ آنکھ کھولتا ہے، تو بستر راحت اور تنہائی کے سوا کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ رات کو ایسے وقت جب سارا سنسار محو خواب ہوتا ہے، خود اس کا دل خاموش ہوتا ہے۔ اس کی رگوں کے لہو بھی محو خواب رہتے ہیں کہ وہی تصویر یا ہزار رعنائی سامنے آجاتی ہے اور جب جاگتا ہے، تو پھر اپنے سوا کوئی نہیں ہوتا۔

خواب کے بعد وہ صورت اب جاگتے میں بھی سامنے آنے لگتی ہے، اب تو بیداری کے عالم میں بھی ہر چہار طرف وہی چاند سی صورت، بڑے ہی ناز و انداز کے ساتھ سامنے سے گزر جاتی ہے، وہ اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتا ہے مگر وہ تو کبھی جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے، کبھی چشموں میں غوطے لگا کر روپوش

ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ تصویر ہر وقت اس کو دکھائی دیتی ہے، گویا اب کبھی تنہا نہیں رہتا۔ چونکہ کوئی دوسرا اس وقت ساتھ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اس کے پاس رہنے لگا:

وہ چاندنی میں کھڑا کوئی نہاتا ہے
وہ کون چاند کی کرنوں کو تیز کرتا ہے

یہ دیکھو کیسا اجالا نظر میں پھرتا ہے
یہ دل بھی، جاں بھی منور ہے، کیسا نور ہے یہ

مگر جب اس چاند کو گلے لگانا چاہتا ہے، تو پھر سارا منظر ختم:

ہنسا وہ چاند، یہ دنیا چمک اٹھی کیسی
ہنسا وہ اور پھر آنکھوں سے میری اوجھل تھا

اس طرح غم سے مانوس ہوتے ہوئے اور جدائی کا احساس دلاتے ہوئے اب وہ خیال کی دنیا میں آخر آ ہی گیا۔

نظر پہ چھایا، دل و جاں میں آج چھا ہی گیا

وہ پاس آتا ہے اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کے، ہر طرح سے بن سنور کر اس کے دل بہلانے کے لئے طرح طرح کی عشوہ گری سے کام لے کر، وہ خیالی پیکر اس کے پاس رہنے لگتا ہے، — یہ ہے عروج، اب تو وہ جہاں جاتا ہے، وہی تصویر اس کے ساتھ ہے، سایہ کی طرح ساتھ ہے اور ایک سچے جیون ساتھی کی طرح اس کی ہنسی پر ہنستا ہے، اس کی تکلیف سے تلملا جاتا ہے۔ گھر والے یہ حال زار دیکھ کر

پریشان ڈاکٹر کے یہاں دوڑے، لیڈی بیکتھ کے مرض کے علاج کے لئے ایک ڈاکٹر بلایا گیا تھا ــــ طبیب آتا ہے اور طبیب کے سامنے بھی وہ شخص وہی اناپ شناپ بولنے لگتا ہے وہ طبیب کو کہتا ہے کہ تم بھی دیکھو، دیکھو اگر تم کو آنکھ ہے، دیکھو، وہ دیکھو کون کھڑا مسکرائے جاتا ہے، وہ کیسا نور ہے، بس جگمگائے جاتا ہے:

ارے یہ تم مجھے حیرت سے دیکھتے کیا ہو
جو دیکھتی ہیں یہ آنکھیں، وہی دکھاتا ہوں

طبیب نے اس کو خود سے اچھی طرح مانوس کر لیا اور اس سے پیار کے لہجہ میں ساری داستان بتانے کی فرمائش کی، مگر وہ شعوری طور پر تو کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ دھیرے دھیرے ساری بھولی بسری باتیں جو اس کے تحت شعور اور لاشعور میں جمع تھیں، نکلنے لگیں۔ اس نے ایک مالوف ماحول پایا اور دل کے سارے راز سامنے رکھ دیئے۔ خوب جی بھر کر محبوب کی تعریف کی، خوب بے خوف ہو کر خویش و اغیار کے طعنوں کا ذکر کیا اور اس کا بھی ذکر کر دیا کہ یہ آرزو کس طرح تشنہ رہ گئی:

کوئی ڈراتا ہے کیا کیا عذاب دوزخ سے
کوئی جلاتا ہے نارِ سعیر میں مجھ کو

اس نے اعترافِ محبت کر لیا، اعترافِ گناہ کر لیا، اب اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا، وہ کئی روز تک اس طرح حال دل کہتا رہا اور ان ناآسودہ آرزوؤں کو ایک ایک کر کے انبار سے چھانٹ کر نکالتا رہا۔ اِدھر اس کی کہانی ختم ہوئی، اُدھر اس کی محبت کی نشانی روپوش ہو گئی، وہ بھلا چنگا تو ہو گیا۔

مگر وہ نور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا:

وہ تارہ چھپ گیا، وہ چاند ہو گیا روپوش
یہ دھڑکنیں ہیں مرے دل کی کیوں خموش خموش

میر کا بھی اس طرح کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، خود ان کی مثنوی خواب و خیال کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے، مگر میر کا علاج دو بار فصد کر کے فاسد خون کے نکال دینے سے ہو گیا، نظم محولہ بالا میں علاج نفسیاتی طور پر ہوتا ہے اور یہی علاج مرض محبت کا مناسب ہے، ورنہ غالب کے شعر کو پڑھیے تو محبت خلل دماغ سے آگے کچھ نہیں۔ میر کے اس قصہ میں دوا خلاف مزاج پڑ گئی۔ اور بجائے افاقہ کے مرض اور بڑھ گیا۔ چونکہ انھوں نے اپنی جنسی خواہشوں کو آسودہ ہونے نہ دیا تھا، ایسی گشتہ کامیاں شاعر کو ایک وہمی دنیا میں لے جاتی ہیں اور جو تمنّائیں اس کٹھور سماج میں بر آ نہ سکیں، وہ اس خیالی خلوت میں پوری ہو جاتی ہیں: ؎

توہم کا بیٹھا جو نقش درست ؛ لگی ہونے وسواس سے جان سست
نظر آئی اک شکل مہتاب میں ؛ کمی آئی جس سے خور و خواب میں

کلی تازہ شرمندہ اس رو سے ہو ؛ خجل مشک ناب اس کے گیسو سے ہو

کبھو صورت دلکش اپنی دکھائے ؛ کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں ؛ کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو ؛ طرح دشمنی کی نکالے کبھو

لیکن :

جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں

بالآخر، طبیب بلائے گئے، دوا پلائی گئی۔ لیکن دوا الٹی پڑی ۔ آخر فصد کھولے گئے اور وہ بھلے چنگے ہو گئے۔

دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں

بہت بیخود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوشی طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

میر نفسیاتی تجزیہ Phycho Analysis سے واقف نہ تھے۔ لیکن یہ ان کا ذاتی عجیب و غریب تجربہ تھا، جو نفسیاتی تجزیہ کا محتاج رہا۔

---

(۱۵)

ابتدا کیا ہے، انتہا کیا ہے
اک فریب خیال ہے کیا ہے

اس مختصر نظم میں شاعر نے ابتدا اور انتہا، آغاز و انجام یا فلسفہ بڑی سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ خیال بلند ہے اور موجودہ دور ترقی کے لئے بہت اہم ہے۔ کیسی وضاحت کے ساتھ اور ایسی ملائم زبان میں سارا فلسفہ شاعری کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ دنیا ایک دائرہ کی سی ہے، وہ دائرہ ہر لمحہ حرکت میں ہے، زندگی ہر آن حرکی ہے۔ اس لئے یہ بتانا دشوار ہو گیا کہ کہاں سے یہ دائرہ شروع ہو گیا اور کہاں ختم ہوا۔ یہ تو دیکھنے والوں پہ منحصر ہے۔ جس کو نقطہ آغاز سمجھیں، اسی لئے دنیا کو مجموعہ اضداد کہا جاتا ہے۔ فرق صرف زاویہ نظر کا ہے۔ ورنہ جو شر ہے وہ خیر (انّ مع العسر یسرا) سمجھئے

سکوت نے بھی بنایا ہے اپنا کاشانہ
درِ امان بھی ہے، دارالسّلام بھی ہے یہاں

آگے چل کر یہ کہنا:

یہ میں نے دیکھا، خدا کا مکاں ہے ویرانہ
عظیم بھی ہے، قوی بھی ہے وہ مہیب بھی ہے

شاید اس جذبہ کی تسکین ہے: ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ اضطراب، انسانیت کو اپیل ہے کہ اس کو اس وقت شعر سے کیا حاصل کرنا چاہیئے اور وہ کیا حاصل کر رہی ہے۔ اس ہنگامے سے پرے اس کو کچھ سکون چاہیئے، اس کی کشتِ وفا کو شاداب رہنے کے لئے بارشِ ایمانی کی ضرورت ہے۔ اسے اپنی دوزخ اور اپنی جنّت پر مطمئن ہو کر قناعت کی زندگی کاٹنی چاہیئے اور اپنے دل کی درستگی و آراستگی میں منہمک ہو جانا چاہیئے۔

اس نظم کی ابتدا اور انتہا دونوں ہی میں مآل شعر کی تعبیر بتائی گئی ہے، کلیم صاحب کے نزدیک شعر یا وہ گوئی کا نام نہیں یہ فن خونِ جگر کی نمود کا فن ہے، اسی نمود فن نے ان کو اونچا اٹھا دیا ہے بہت اونچا۔ وہ اس بلندی پر پہنچ کر کہتے ہیں کہ یہی بلندی مآل شعر ہے، کہ اس بلندی سے ہم انسانوں کے دلوں کو جھانک سکتے ہیں، یہی وہ دل ہے جو مسکن ظلمت ہے اور مامن نور۔ اس دل کے جلوے لطافت و کثافت کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ اس میں فنا اور بقا کے کرشمے نظر آتے ہیں۔

ساتھ آرام ہے، جو موت ہے، وہی زندگی ہے اور جو زندگی ہے، وہی موت (یخرج المیّت من الحی و یخرج الحی من المیّت) مردہ کو زندہ سے اللہ نکالتا ہے اور وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے) جو سفر ہے، وہی حضر ہے۔ اور جو حضر ہے وہی سفر، اس احساس سے انسان دنیا کو زندہ رہنے کی جگہ متصور کرتا رہے گا اور ساتھ ساتھ اس کو مزرع آخرت بھی بنائے رکھے گا۔

کہنے کو تو ایک معمولی سی بات ہے اور ہر شاعر نے جانے یا انجانے طور پر اس کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہاں وہی بات تجربوں کی روشنی میں بتائی گئی ہے۔ اردو شعراء اپنے محسوسات کو تاثراتی طور پر بیان کرنے کے عادی تھے اور ہیں۔ مگر اس نظم میں ان احساسات کو متشکل بنا کر بیانیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہاں تو یہ معمولی سی بات ہماری حیات و کائنات کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس فلسفہ کے پیش نظر، بلکہ اس حقیقت کے زیر اثر انسان برابر جستجو اور آرزو میں مشغول رہے گا اور زندگی نام ہی ہے جستجوؤں اور آرزوؤں کی آماجگاہ کا۔ انسان روز نخست سے جستجو کا عادی ہو گیا، اس کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے کیوں اس شجر کو ممنوعہ قرار دیا، جستجو ہی زندگی کا مقصد ہے اور جستجو کرتے کرتے سب اسی مقام پر آجاتے ہیں، جو نقطۂ ابتدا تھا: ع

'جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی'

پھر یہی نقطۂ ابتدا، نقطۂ انتہا میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح زندگی کا چکر چلتا رہتا ہے، تاکہ زیست کی بے پایانی کا احساس ابھرتا رہے کہ اس احساس بے پایانی سے زندگی کی کشش برقرار رہ سکتی ہے اور انسان اپنے

فرائض ادا کرنے کے لائق رہ سکتا ہے، ورنہ انجام تک آتے آتے اعضا شل ہو جائیں گے اور جوارح جواب دے دیں گے۔ دنیا ساکت اور جامد ہو جائے گی اور پھر، پھر جینا محال ہو جائے گا اور حیات ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔

اس خیال کو دلنشیں کرنے کے لئے پانچ تجربے پیش ہوئے ہیں، پہلا تجربہ گھڑی کے دیکھنے سے سامنے آتا ہے۔

یہ گھڑی ہے جو دستِ نازک میں
تم نے دیکھا یہ کیسے چلتی ہے
اس کی ننّھی سی جان رقصاں ہے
مجھے یہ وقت کے بتاتی ہے
کیسے چلتی ہے، چلتی رہتی ہے

شاعر یہاں اپنے جیون ساتھی کو مخاطب کر رہا ہے، ورنہ دستِ نازک کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، شاعری کو صنفِ نازک سے خاص رفاقت ہے اور اسی رفاقت کی وجہ سے شعرا عام طور پر اپنا مخاطب عورت ہی کو بناتے ہیں۔

قدیم عربی شاعری میں تو اس کا رواج عام تھا اور اس کی توجیہہ بزبان آرنلڈ یہ تھی کہ ان کی شاعری ان کی سچی زندگی کا آئینہ ہے، یہاں بھی ہم کلیم صاحب کی شاعری کو حقیقی زندگی کا عکس ماننے پر مجبور ہیں۔

اس گھڑی کو دیکھو، ہر آن، ہر لمحہ چلتی رہتی ہے اور ایک ہی محور پر رقص کرتی ہے، کہاں سے رقص شروع ہوا اور کہاں ختم ہوا۔ کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ ہر نقطہ نقطۂ ابتدا ہے اور جو نقطہ ابتدا ہے اسے نقطۂ انتہا کہنا

پڑتا ہے، ورنہ انتہا کہاں۔ اسی طرح اس کی چال، متوالی چال سے ساعت بنتے ہیں اور یہی ساعت روز و شب کا جال بُنتے ہیں اور یہی روز و شب ماہ و سال میں تبدیل ہو کر ماضی، حال اور استقبال کا دائرہ بنا ڈالتے ہیں اور بناتے رہتے ہیں، جن سے قرن اور صدیاں بن جاتی ہیں، کبھی اس کو قرار نہیں، برابر بنتی ہی رہتی ہیں اور بنتی ہی رہیں گی۔

ایک دائرہ پر نظر کرو اور غور کرو، یہ دائرہ
مثل پرکار ساری گردش ہے
دائرے، دائرے بناتے ہیں

یہ رنگ برنگی دائرے نظروں میں آتے ہیں، گھومتے ہیں، گھومتے جاتے ہیں۔ ٹوٹتے ہیں، مٹتے ہیں۔ مگر بنتے ہی رہتے ہیں:

یہی بنیاد ہر دو عالم ہیں
ان کی آغوش میں مکاں بھی ہے
اور سمجھو تو لامکاں بھی ہے

اس لئے کہ لامکاں بھی ایک ٹھوس زندہ حقیقت ہے، موجود ہے اور موجود رہے گا، وجود کے لئے تو حرکت ضروری ہے۔ اس لئے دائرے کی اس گردش میں لامکاں بھی پوشیدہ ہے۔

دیکھو دیکھو یہ ننھا سا تخم، اس کا حقیر جسم دیکھو، اس کی بساط ہی کیا ہے، لیکن یہی تخم، ایک تناور اور ڈیل ڈول والا درخت بن جاتا ہے۔ جس کی جڑیں، مٹی کو، پتھر کو توڑتی ہوئی، سینہ گیتی کو شق کرتی رہتی ہیں۔ ان درختوں کی لمبی لمبی شاخیں، آسمان سے باتیں کرتی ہیں، ان کے سبز سبز زمرد کے تھال سے

پر سایہ فگن رہتے ہیں، مگر یہی درخت گرتا ہے اور پھر وہی تخم کی شکل میں بدل جاتا ہے اور پھر اس تخم سے درخت بنتا ہے، یہ سلسلہ لامتناہی برابر سے جاری ہے اور برابر جاری رہے گا۔

خود اس زمرد میں پتّہ کو دیکھو، قدرت صانع کا بولتا ہوا نمونہ، کون الٹا ہے، کون سیدھا ہے، یہ خوش رنگ پتّے دل و جان کی کشش کا سبب بنے جاتے ہیں اور پھر یہی ہرے ہرے زمرد، لال لال لعل بن کر، اُجلے اجلے موتی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ پھر دوسرے زمرد اور جواہر اگ آتے ہیں، یہ ہے تسلسل حیات، اور یہی ہے وجہ زیست حیات۔

کون باقی ہے، کون فانی ہے
رنگ اک بار جو جھلکتا ہے
نقش وہ پھر فنا نہیں ہوتا

یہ نیم باز مست آنکھیں، کلیوں کی تو دیکھو، کس حیرت سے ہمارا منہ تک رہی ہیں، وہ زندگی کے راز دوام کو اپنی ہنسی سے ظاہر کر رہی ہیں۔ یہ مسکرا کر پھول بنیں اور ان کے کٹورے شبنم سے بھر گئے، صبح ہوئی خاور خورشید نے ان کے موتی چرا لئے، پھول کملائے اور گرے، مگر دوسری کلیاں اس ڈالی میں پہلے ہی سے وہی پرانا کھیل کھیلنے کو تیار رہتی ہیں اور یہ کھیل فنا و بقا کا جاری رہتا ہے۔ ان کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہوتا رہتا ہے اور اسی طرح ان کی خوشبو، ان کے رنگ، ان کی کشش، ختم ہو کر دوسرے پھولوں میں تبدیل ہو جاتی ہے:

رنگ کی انتہا ہے بے رنگی

اسی بے رنگی میں ہے رنگینی
عطر بھولا ہوا فسانہ ہے
ہے معطر مشام جاں کیسا

'زحمتِ مہر' پر یہ لرزاں ہے' میں زحمت کا لفظ دہشت سے زیادہ بلیغ ہے۔ اب شاعر ان تجربوں کو پیش کر کے ایک نتیجہ نکالتا ہے، وہ عام اُردو شعراء کی طرح صرف نتیجہ بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا:

جو عدم ہے وہی بقا بھی ہے
موت سے زندگی نکلتی ہے

اس طرح موت بھی انسان کو مار نہیں سکتی۔ بلکہ یہ آگے بڑھنے کا سلسلہ ہے، جو مرتا ہے وہ ملکِ عدم جا کر ایک نئی زندگی بناتا ہے، غور کیجئے کہ شاعر نے زبان پر مہر لگاتے ہوئے بھی کیا پتے کی بات کہہ دی ہے اور کس انداز سے کہا ہے۔ جس میں عقیدہ کو دخل نہیں۔ بلکہ تجربہ اور فلسفہ نے اس خیال کو اُبھارا ہے۔ آدم کی فطرت مضطرب ہے، وہ برابر تلاش میں ہے، اس کو اپنی ابتدا کا پتہ اس طرح چل سکتا ہے، کہ جو ابتدا تھی وہی تو پس از مرگ انتہا بن کر آئی اور انسان جب اپنی بساط سمجھ گیا، تو اپنے رب کو بھی سمجھ لے گا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا)۔ شاعر کا طائرِ خیال کچھ اور بلند ہو کر پھر انسان کی تقدیر ہی کے گرد آتا ہے:

چال جو ہے وہی سکوں بھی ہے
خامشی جو ہے، وہ صدا بھی ہے

جبر جو ہے وہ اختیار بھی ہے
شر کو دیکھو، تو خیر بھی ہے وہی

ان چار مصرعوں میں ایک پائدار حقیقت بتائی گئی ہے، ہر حرکت سکون سے اور ہر سکون حرکت سے پیدا ہوا ہے۔ یہ حرکت و سکون کی خاصیتی آپ ہی 'صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے'۔ 'خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری'۔ میر نے کہا تھا ع "ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی" یہ مصرع انسانی زندگی کو جمود و خمود کی طرف لے جانے والا ہے اور انسان کو اپنی جبلّی قوتوں سے محروم کر دینے والا ہے۔ شاید اسی تعلیم کا ردعمل ہے جو کلیم صاحب نے تجربات کی ایک زنجیر بنا کے جبر اور اختیار کا حلقہ تیار کر کے رکھ دیا ہے، کیسا جبر، کیسا اختیار، یہ تو ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں 'شر کو دیکھو، تو خیر بھی ہے وہی'۔ دنیا میں شر محض ابلیس کو بتایا گیا ہے، اب ذرا سوچیئے کہ اس شر محض نے کس طرح خیر کی راہ کھول دی ہے۔ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے اپنی لاشریک عبادت کا اظہار کیا ہے۔ جو توحید کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ شر کا عمل نہ کرتا تو آدم دنیا پہ نہ آتے۔ اس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کو جاننے والے صرف ملائکہ ہی رہ جاتے حالانکہ خدا کا خود خیال ہوا فاحببتُ ان اعرفَ (میں نے خواہش کی کہ میں جانا جاؤں) یزداں کی خواہش کی تکمیل، اسی شر محض کے اظہار فتنہ و شر ہی پر منحصر تھی۔

میرے خیال میں یہ نظم یہیں پر ختم ہو جاتی تو اچھا تھا ــــ مگر شاعر کو شاید خیر اور شر کے تصوّر نے پھول اور شعلے کے رشتوں کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔

یہ لال لال گلاب کے پھول، اور یہ دہکتے شعلے، ایک دوسرے سے کسب رنگ کرتے ہیں۔ شعلوں نے پھول کی لطافت لی۔ پھول نے شعلے کی زبان لی، اور دونوں حیرتی ہو کر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور ایک دوسرے پر ہنس رہے،

پھول ہے یہ جو دل میں خنداں ہے
ایک شعلہ ہے جو لپکتا ہے

ضمنی طور پر ۱۹۲ مصرعوں میں بعض باتیں ایسی آگئی ہیں، جو انسانی قدروں کو استمرار بخشنے میں مدد دے سکتی ہیں، فلسفہ دانوں کا خیال ہے کہ ہر دو حرکت کے درمیان سکون کا ہونا لازم ہے۔ ہم ایک ڈھیلا اوپر پھینکتے ہیں، تو اوپر جا کر وہ نیچے کو آتا ہے۔ اس درمیان ایک ہلکا سا وقفہ ضرور ہے اس لئے "ایک حرکت، حرکت قسری کے تحت ہے اور ایک حرکت حرکت فطری کے تحت" لیکن فطری حرکت میں وقفہ ہو جائے تو ساری کائنات درہم برہم ہو جائے یہی راز دوام زندگی ہے۔ زندگی جہد مسلسل اور حرکت پیہم سے عبارت ہے۔ اس لئے موت بھی انسان کے اعلیٰ عزائم کو پامال نہیں کر سکتی، وہ موت کی یاد کر کے منقبض بھی نہیں ہو سکتا اور جس فرد نے یا جس جماعت نے موت کا خوف نہ کیا، یا موت کو زندگی کا دوسرا نام دیا، وہ فرد اور جماعت بقائے اقویا کے دور میں، آگے ہی بڑھتی رہے گی، اب اگر ہم یہ کہیں کہ اقبال کی خودی بھی موت اور حیات کے اس عملی پہلو پر قائم ہے، تو ہر طرح درست ہوگا۔

اس نظم میں بعض ٹکڑے شاعری و صناعی اور شاعری و فطرت کی جاندار مثالیں ہیں۔ خصوصاً دوسرے بند میں ملاحظہ کیجئے شاعری تخیل کیسے کیسے گل کرتی ہے۔

اور کس طرح نت نئی بہار الفاظ سامنے لاتی ہے۔ اسی لئے ایک ایک خیال کو ذہن نشین کرانے کے لئے اس کے ہر ٹکڑے کو اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہے بیانیہ کی کامیابی۔ الفاظ روزمرہ کے ہیں جن کے انتخاب میں کسی شعوری کوشش کا دخل نہیں، بے ساختہ اور معنویت سے پُر:

نور ظلمت کو صید کرتا ہے
اور پھر خود شکار ہوتا ہے
صید ہے کون، کون ہے صیاد

کیسا سادہ انداز ہے، مگر تہہ کو اُدھیڑیئے تو کیسا بانکپن اور کیسی پیچیدگی، کہ جیسے جیسے سمجھتے جائیے، زندگی کا لطف ملتا جائے۔ بعض استعارہ بیباک سا ہے، جو بے ساختگی میں مجنوں کی آنکھوں کے ذکر کے بعد زبان پر آجاتا ہے۔ "ابھرے سینے یہی ہیں لیلیٰ کے"۔ غالب کے بعض مصرعوں کا استفہامیہ انداز بدل کے اثباتی اور منطقی انداز میں بدل دیا گیا ہے:

سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
شکنِ زلف عنبریں دیکھو
نگہۂ چشم سرمہ سا دیکھو

---

(۱۶) اس چھوٹی سی نظم میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا خیال کس طرح تمدن و تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ارتقا پذیر رہا ہے، یوں کہئے کہ مذہبی معتقدات کس طرح دھیرے دھیرے کمال کی طرف بڑھے ہیں اور انسانیت نے

کیسے رفتہ رفتہ اپنی تکمیل کے مدارج طے کئے ہیں۔ جس زمانہ میں انسانیت تتلا رہی تھی، خدا کی بابت نظریہ بھی ویسا ہی بچپن کا سا تھا۔ "اور بازاری نے آئے اگر ٹوٹ گیا" جب انسانیت گھٹنوں کے بل چلنے لگی۔ انسان ہر مہیب شئے کے سامنے جھکنے لگا، جب انسانیت جوانی کی منزلوں کو طے کرنے لگی، تو خداؤں کی تعداد محدود کی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ انسانیت کے بلوغ و بنوغ پر خدا کا تصور بالیدہ، پختہ اور مکمل ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ پختگی آدمیت کے باوجود آدمی ابھی تک اسیر طفلی ہے اور بچپن کے کھلونوں کو معبود بنائے بیٹھا ہے۔ اپنی گمراہیوں کے ہر نشان کو تاریخی ابدیت عطا کئے ہوئے اپنے میلان پر قائم رہا۔ راستہ مل گیا مگر کچھ ایسے ہوئے کہ راستہ ہی میں رک گئے، کچھ آگے بڑھ گئے۔ شعور پذیر انسانیت مضطرب ہوئی کہ کوئی سہارا معبود کا پیدا کیا جائے:-

پیہم یہ کیوں خلش ہے
کیوں سوزش دروں ہے
دل اس کو ڈھونڈتا ہے
جو اپنا آسرا ہو

اس نے زمین پر ہر طرح کے فتنے دیکھے، دن کی روشنی، رات کی تاریکی میں نہاں تھی، انسان انسان کو مجبور و مقہور بنا رہا تھا، جو ظلم و ستم کے جال بچھائے ہوئے تھے؛ ابتدا میں تو ہر جگہ ظلمت و تاریکی ہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تاریکی دور ہونے لگی، آسمان تاروں کی محفل سجی، زمین کی ظلمت دور ہوئی، انسان نے سمجھ لیا یہی تارے فرماں روا ہیں۔ یہی تارے معبود ہیں:

ہاں آؤ، ان کو پوجیں
دل ان کو ڈھونڈتا تھا

اب انسان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ اپنے چاروں طرف نور کے خزانے بکھرے ہوئے پانے لگا اور اس کو دماغی سکون مل گیا! — مگر تارے تو چاند کے بندے تھے، چاند نکلا اور ان کی شان ختم ہو گئی اب یہ تارے ایک ایک کرکے روپوش ہو رہے ہیں۔ یہ پھول چمنِ فلک سے جھڑ جھڑ کے گرنے لگے۔ چاند کو دیکھ کر اب وہ چاند کی طرف متوجہ ہوتا ہے:

اے چاند تو خدا ہے
سجدہ تجھے روا ہے
آ میں بھی تجھ کو پوجوں
اپنا خدا بناؤں

چاندنی بھی شب بھر قائم رہتی ہے اور اس کے ذہن کو انبساط اور دل کو انشراح دیتی ہے، (یہ لفظ انشراح کا قرآن پاک کے الفاظ کی گونج ہے۔ الم نشرح لک صدرک):

اب بے کلی کہاں ہے
وہ جانکنی کہاں ہے
اب چین ہے سکوں ہے

مگر چاند بھی تو سورج کا بندہ ہے، رات کے ختم ہوتے چاند کا چہرہ زرد ہو گیا، وہ نور کا چشمہ، بے نور کا طبق بن گیا اور رفتہ رفتہ روپوش ہونے لگا:-

یہی ہے تخم بقا اور یہی ہے تخم فنا
یہی ہے سوز محبت، یہی شکست وفا
مآل حسن یہی ہے، مآل شعر یہی
یہی ہے نکتۂ ایماں، یہی پیام ازل
اسی میں شعلے دہکتے ہیں اپنی دوزخ کے
اسی میں پھول مہکتے ہیں اپنی جنت کے

کلیم صاحب ثقیل الفاظ اور نامانوس تراکیب نہیں لاتے۔ اس نظم میں بعض الفاظ اور بعض ترکیبیں جاذب نظر ہیں۔ مثلاً شرنگ نفرت، بلندی تنہا، غربت خیمہ زن، فلک کاسمٹ کے زیر زمیں چھپنا، (یہ انداز میر انیس کا پرتو ہے) طوفان ازل فروش، زر درد دنیا، گندی دنیا۔

اس مجموعہ کی دوسری نظمیں ڈرامیٹک مونولوگ ہیں، ان میں دوسروں کی گفتگو اور ان کے جذبات کا دخل ہے اور انتساب والی نظم ایک طرح کی سولیلوکی ہے اور خود کلامی، اس لئے بھی ممکن ہے کہ اس نظم کو دوسری نظموں سے الگ رکھا ہے اور اس کا شمار بھی نہیں کیا گیا ہے۔

پہلی نظم، جس کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے:

یہ کس کا جنازہ اٹھ رہا ہے

۲۲۶ مصرعوں کی ایک مکمل نظم ہے۔ اس میں ارتقائے خیال عجب پیچیدہ طور پہ چلتا ہے۔ یہ نظم ابتدائی انتسابی نظم کے بعد خیال کے کہسار کے دوسرے رخ کو پیش کرتی ہے، اس میں شاعر نے دنیا سے بیزاری اور کسی دوسری دنیا کی پائداری کا ذکر کیا تھا اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان مجبور ہے۔ جبری تجسم

اب کیوں وہ ہو رہا ہے
میری نظر سے روپوش
کیسے میں اس کو پوجوں
کیسے خدا بناؤں

اب دن کا اُجالا پھیلنے لگا: ؎

صبحدم دروازہ خاور کھلا — مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

آفتاب کی عظمت اور نور کی حدت اور اس کی شدت نے آدمی کو مجبور کیا کہ وہ اسے خدا سمجھے اور اس کی عبادت کرے:

یہ حسن لم یزلی ہے
چمکے گا یہ ہمیشہ
کوندے گا یہ ہمیشہ

انسان نے اس آخری سہارا کو دن کی روشنی میں پاکر بڑی ہی اُمیدیں وابستہ کی تھیں:-

اے پاک پاک شعلے
لَو اپنی تیز کر دے
دُنیا کو جگمگا دے
دہشت سے جاں چھڑا دے
آ، مشکلوں کو میری
آسان آج کر دے

آفتاب اپنی روشنی اپنی تیز تیکھی کرنوں سے ساری دنیا کو واقعی جگمگاتا رہا، تاریکی کافور ہوگئی۔ شرم نے شرم سے منہ پر نقاب ڈال دی۔ مگر، یہ بھی تو کسی کا بندہ ہے، دوپہر ڈھلتے ہی اس کی برنائی بھی کم ہونے لگی اور شام ہوتے ہوتے مغرب کی وادیوں میں، بڑے ارمانوں سے سجایا ہوا معبود روپوش ہوگیا۔

کیسا یہ دیوتا ہے
اب کون اس کو پوجے

اب انسان پر حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ سائنس کے انکشافات نے تارے، ماہتاب اور آفتاب کی ماہیت بتادی۔ اب تو وہ کسی ایسی ذات کا متلاشی ہے، جو خالقِ ارض و سما ہے، جس نے تارے بنائے۔ چاند بنائے، سورج بنائے۔

اب وہ اپنی فطرت کی پکار کی طرف آتا ہے، وہ ذات ایسی ہے کہ جس کی صفات بھی پائندہ و دام ہیں۔ ذات اور صفات ازل اور ابد کے دو کنارے ہی تو ہیں:

ظاہر اسی سے روشن
باطن اسی سے رخشاں
اوّل ہے ذات اس کی
آخر صفات اس کی
کیا حد کو پوچھتے ہو
وہ بحرِ بیکراں ہے

شعوری ہو یا غیر شعوری، کلیم صاحب نے اس نظم میں بھی بعض ایسے تصور کو بیان کر دیا ہے، جن پر انسان کی ملکی اور ملکی زندگی کا انحصار ہے۔ آدمی نے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے، شر کے آہنی پنجوں سے رہائی حاصل کرنے کے لئے بے اطمینانی دور کرنے کے لئے خدا کی تلاش جاری رکھی کہ اسی کی ذات سے یہ پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں ــــ یہ بھی قدرت کا کھیل ہے کہ انسان کو جس خدا کے تخیل نے ظلمت سے نکال کر نور سے ہم کنار کیا تھا۔ آج اسی خدا کے شعور نے انسان کو بار دگر نور سے ظلمت کی طرف ڈھکیل دیا، ہم نظم نمبر ۱۵ میں جان چکے ہیں کہ کوئی شئے ایک حالت پر نہیں ٹھہری رہتی، زمانہ چل رہا ہے۔ منقلب ہے، اس لئے اس کی پوری امید بلکہ اس کا یقین ہے کہ انسان پھر اسی ترقی یافتہ خدا کی بدولت، ظلمت سے نور کی طرف آجائے گا: ع ــــ

خلیل اللہ کے دریا میں پھر ہوں گے گہر پیدا۔

ان ۱۷ مصرعوں کو نظم نمبر ۱۳ سے ملا کر پڑھئے تو ایک لمبی نظم بن جائے گی، حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ذکر، ان کی دہشت، ان کی ضرورت کو قرآن نے واضح طور پر بتایا ہے، آخر جب انھوں نے آفتاب کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا، تو کہہ اٹھے، انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین (میں نے تو اس کی طرف توجہ کی ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، میری توجہ مطیع و منقاد ہے اور میں مشرک میں سے نہیں ہوں)

دو مصرع اور بھی قابل غور ہیں۔ ہمارے یہاں غلاموں کے دیس میں اس دیس میں جہاں اُجلوں نے کالوں کے سارے کس بل توڑ دیئے تھے مشرق اور

مغرب کا استعارہ آزادی اور غلامی سے ہوتا ہے۔ ایسے آفتاب کو کیوں پوجیں کہ مشرق نے اس سے کسب نور کیا اور مغرب کی طرف نور لٹانے چلا گیا۔

مشرق تھا جس کا مطلع
مغرب ہے اس کی منزل

یہ نظم صاف ہے، سادہ ہے اور نظموں کی طرح کوئی پیچیدہ خیال بیان نہیں ہوا ہے، مگر یہ خیال انسانیت کی بنیاد ہے۔ ہمیں اس میں فکر و فلسفہ کی آمیزش کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے معنوی اہمیت نے اس کی کشش کی ضمانت لے رکھی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس ارتقا پذیر دور میں، خدا کی بابت خیال اگر صراط مستقیم پر آجائے تو یہی فوز و فلاح کا موجب ہے۔

---

(۱۷) یہ نظم چھوٹے بڑے ۱۳۶ مصرعوں پر مشتمل ہے، اس میں شاعر نے خدا کے بارے میں اس تخیل کو پیش کیا ہے، جو عام طور پر لوگوں نے بنا رکھا ہے اور پھر ردعمل اللہ کے اس سکوت مسلسل کا ہے، جس کی شکار اندنوں انسانیت ہے بیان، ابہام اور استعارہ کی مدد لئے ہوئے سامنے آتا ہے اور یہ ایسا مقام ہے کہ ابہام اور استعارہ کی ضرورت بھی ہے، شاعر اپنی قوت تخیلہ کی مدد سے جو دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑ جیسی بلندی پر ایک پتھر کا دیوتا نصب کیا ہوا ہے، زمانۂ قدیم سے یہ اسی طرح آرہا ہے، ایک برہمن اس بت کے نزدیک جاتا ہے۔ بت اس سے طرح طرح کی باتیں کہتا ہے۔ اس بت کو اس کا اعتراف ہے کہ اس برہمن میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ اس کی پوشیدہ رعنائیوں کو وہ دیکھ سکتا ہے

اور ان کا راز بھی فاش کر سکتا ہے ۔ گویا یہ برہمن ہمراز رازِ قدیم ہے ۔ بُت نے تو برہمن کی ہمت شکنی کی اور کچھ اپنی معذوری کا اظہار کیا ، لیکن اس امر کی خواہش بھی ہے کہ اس کی ذات اور اس کی صفات کو لوگ اچھی طرح جان جائیں ۔ اس بُت کو اپنے برہمن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ تم اپنے فن کے جادو جتنا چاہو جگاؤ اور جس طرح چاہو اسے شکار کر لو ، وہ بت پھر اس برہمن کو کہتا ہے کہ اس نے اتنی ساری جگر کاویاں تو کیں کہ اس کی ذات و صفات کے کنہیات کو برملا کر دے ۔ مگر کبھی اس نے اس پر غور کیا ہے کہ اس کا اصل مقام کہاں ہے ؟ —— وہ ہے انسان کا دل ، کبھی اس برہمن نے انسان کو اس نگاہ سے دیکھا بھی ہے ۔

ایک پتھر کے دیوتا کو خیال کی انتہائی بلندی پر براجمان دکھا کر شاعر نے دو فائدے حاصل کئے ۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ پتھر کے تراشے ہوئے بت بھی جو اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کی علامت ہیں ، حق کی طرف رہبری کر سکتے ہیں ، بشرطیکہ طلب میں خلوص ہو ۔

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے ٭ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دوسرے یہ کہ آج کی دنیا میں جبکہ انسان قہر و تشدد کا شکار ہو رہا ہے ، ہر طرف باطل کا نرغہ ہے ۔ حق روپوش ہو گیا ہے ، جیسے بزبانِ نظیرؔ بہرا ہوا خدا ہے ، خدا نے مکمل سکوت اختیار کر لیا ہو ۔ پریشان کر دینے والی خاموشی ، اس سکوت اور خاموشی یزداں کو مجسم پتھر کا دیوتا بنا کے پیش کیا گیا ہے ۔ یزداں کا حیرتی ہو کر مہر بلب ہونا ، اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ انسان کے افعال سے راضی نہیں اور اپنی عدم رضا اور

اپنے انقباض کو لفظوں لفظوں میں بُت نے بتا بھی دیا۔ یزداں کی خواہش ہے کہ لوگ اس کو، اس کی ذات کو اور اس کی صفات کو اچھی طرح جانیں اور ذات اور صفات کے تقاضوں کو پورا کریں۔ مگر علم والوں نے، فلسفیوں نے، تصوّف کے شیدائیوں نے ذات اور صفات پر ریسرچ تو کر لیا۔ بال کی کھال نکالتے گئے، اور ایک ایک صفت پر آپس میں نزاع کرتے رہے۔ مگر صفات ان سے کیا چاہتی ہیں، وہ یہ نہ سمجھ سکے۔ وہ ذات ان سے کیا مطالبہ کرتی ہے، وہ جان کے انجان بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات نے انسان کی ذات و صفات کو جلا پذیر ہوتے رہنے کے لئے دو طرح کے حقوق سے آشنا کیا ہے۔ حق العباد اور حق اللہ:۔

ان رموز معالم غیب کے دعویداروں نے کسی طرح حق اللہ کو تو پورا کر دیا، عبادت میں کوئی کسر نہ رکھی اور منشا خلقت انسان کا ایک پہلو مکمل کر لیا۔ اس لئے کہ قرآن پاک میں ہے: وَمَا خلقت الجن والانس الا لیعبدون (میں نے جن اور انس کو اسی کے لئے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں) مگر وہ اس کو فراموش کر گئے کہ عبادت سے مراد صرف پرستش اور پوجا نہیں انسان کے حقوق ادا کرتے رہنا بھی عبادت ہے۔ اس لئے جن اکابر علماء نے عبادت تو کی، لیکن انسان کی حق تلفی کی اور اس حق تلفی کی راہ کھول دی، وہ درحقیقت اللہ کی عبادت سے محروم رہے۔ انسان کا یہ عمل، اس کی عبادت سے اس طرح انحراف قرنوں اور صدیوں سے جاری ہے، جس کو دیکھ کر بت نڈھال ہو رہا ہے، غم و الم کی جھُرّیاں اس کے چہرے پر پڑ گئی ہیں۔ انسانوں کے گوناگوں وہم و گمان نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دی اور وہ خاموش ہو گیا۔

دور رو پوش ہو گیا ہے، خود بھی محو حیرت ہو گیا اور ہم سب، کو جن کو اس کی ضرورت تھی، محو حیرت کر دیا۔ اسی خاموشی اور محویت کو بُت سے استعارہ کیا گیا ہے۔ یوں بھی دیکھئے کہ اللہ کے لئے بُت کا استعارہ کوئی نیا نہیں۔ خصوصاً شعراء کی جماعت کے لئے جن کا کام ہی ہے کہ ہر وادی میں بھٹکتے رہیں اور اگر انسان ذرا سوچے تو ظاہر ہو جائے کہ وہ اپنی آستینوں میں، اپنے سینوں میں کتنے بُت چھپائے پھرتا ہے۔ اس کی گفتار میں کتنے بُت نکلتے ہیں، اس کے جلو میں کتنے بُت چلتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں کتنے بُت سمائے ہوئے ہیں۔

پہلے حصّہ میں ایک بلند اور رفیع پہاڑ کا ذکر ہے جس پر کوئی دیوتا نصب کیا ہوا دکھائی پڑتا ہے، اس پتھر کے بُت کی ہیئت کذائی کا شاعرانہ بیان ہے، اس کے ہونٹ پتلے ہونٹ جیسے پتھر کی ہلکی سی لکیر ہو۔ اس کے ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے ماضی کی ساری بلندیوں کو وہ اپنی ہتھیلی پر لئے بیٹھا ہوا ہے، نہ معلوم اس کی آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں، جو زمانہ قدیم سے دور دیکھتی جا رہی ہیں۔ دیکھئے دیکھتے جیسے ہوں وہ پتھرائی ہوئی۔

آئے طوفاں کہ بجلی کڑکے
زلزلہ آئے، فلک ٹوٹ پڑے
اس کی پلکیں تو جھپکتی ہی نہیں
یہ کھُلی آنکھیں، کھُلی رہتی ہیں

پتھرائی ہوئی پر غور کیجئے، تو معنویت کی چند تہیں ملیں گی —

اسی طرح :

آج اس سر بفلک چوٹی پر
دیکھو تو عرش بریں سے کس نے
دیوتا لا کے بٹھایا ہے یہاں

کے ٹکڑے کو پڑھیے تو میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ شاعر نے خدا ہی کو مکمل ساکت و خاموش بنا کے پیش کیا ہے ۔ نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ جنت سے حضرت آدم آئے تھے اور اس نظم کے آخر میں انسان ہی کی عظمت اور اس کو خدا کا آئینہ بتایا گیا ہے ۔

اپنے پرانے پجاری کو آتا ہوا دیکھ کر وہ دیوتا اظہار رضامندی کے طور پر برہمن کی کوششوں کو سراہتا ہے، وہ اس کا قدیم محرم راز ہے، اس کی ذات و صفات سب کا دیکھنے والا ہے، اسی لئے وہ ایک دیوتا سے روز بیشمار دیوتا بنا کر نئے نئے حسن اور نئی نئی زینت انھیں بخشتا ہے، وہ برہمن اور نزدیک ہوتا ہے، تو وہ دیوتا اس کی جویا نگاہوں کو دیکھ کر اور بھی متعجب ہوتا ہے اور اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ برہمن اگر چاہے، تو اس کے راز کو فاش کر دے سکتا ہے ۔ اس لئے کہ اس نے وہ سارے مناظر دیکھے ہیں، جو ابھی تک خود اس کی نظروں سے نہاں ہیں ۔

جب وہ برہمن قریب آیا، تو اس دیوتا نے اپنی بے نیازی اور کم مائگی کا اظہار کر کے اس کو اور اس کے منصب کو اور بھی بلند کر دیا :

ارے کیا کہتے ہو، کیا مانگتے ہو
میرے دریا میں صدف کوئی نہیں
دل کے دامن میں گہر کوئی نہیں

اگر وہ بت ہے تو واقعی وہ بے مایہ ہے اگر وہ بُت بن گیا ہے، تو انسانوں نے اس کی ساری صفتوں کو اپنے درمیان بانٹ لیا ہے، اس لئے وہ طنزاً یہ کہہ اٹھتا ہے۔ ان مصرعوں میں مجھے اقبال کے مشہور قطعہ کا ردعمل معلوم ہوتا ہے، وہ قطعہ یہ ہے:

ترے شیشے میں مئے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے، یہ رزاقی نہیں ہے

وہ دیوتا اپنی مجبوریوں کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح مرورِ ایام نے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دی ہے اور دھیرے دھیرے اس کا تاباں و رخشاں چہرہ کثافتوں کے انبار میں میلا ہوا جا رہا ہے۔ اس برہمن کا جواب سنئے:

اس برہمن نے کہا: تو یہ مرا آئینہ
کیسا شفّاف ہے روشن بھی ہے
دیکھو اس میں رخِ زیبا اپنا

یہاں آئینہ سے مراد یا تو اس برہمن کا وجود ہے، یا اس کا دل ہے جس میں اس کے صانع کی صورت صاف جھلک سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیا پھر منور ہو جائے اور خواہشِ یزداں بھی ہے کہ دنیا امن و رحم کا مسکن بن جائے اور دل سے ساری تاریکیاں دور ہو جائیں۔ وہ بُت اسی طرح کی باتیں کہنا چاہتا ہے کہ اس کو اپنے جانے پہچانے جانے کی خواہش بار بار اُبھرتی ہے (فاجبتُ ان اُعرف) مگر بات دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے زبان پر نہ آسکی، شاید ابھی تک وہ وقت نہیں آیا ہے۔

میرے قرآن کی آیات ہوں بیّن ایسی
ساری دنیا انھیں دیکھے اور انھیں پہچانے

اس دیوتا کو اس برہمن کی ذات سے امید ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ ضمیرِ وجود کو چیر کر بار دگر اسرارِ الٰہی کے پردے چاک کر سکتی ہے۔
اس کی صلاحیتوں بے پناہ صلاحیتوں سے مرعوب ہو کر وہ دیوتا کہہ اٹھتا ہے:

دیوتا بن کے وہ بیٹھے وہ رچائے محفل
میری پُر نور شعاعوں کو وہ اپنا کر لے

اب تو اسی فن کارِ عظیم سے توقع ہے کہ وہ فطرت کی رعنائیوں اور شادابیوں سے اپنے فن کی نمود کے لئے خونِ جگر حاصل کرے، اور پھر اِن سے ایک دھنک بنائے، جو آسمان کو بھی زیب دے اور زمین کو بھی نکھار دے کہ نور نور بن جائے اور ظلمت کا فور ہو جائے،

جسم و جاں رقص کریں، رقص کریں، رقص کریں

اس ٹکڑا کے اعادہ سے اس کی اہمیت اور اپنی آرزو کی تکمیل پر خود شاعر کی مسرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خیال پر مجھے اقبال کے نئے شوالہ کا پرتو نظر آتا ہے، یہاں پر شاعر نے نور حاصل کرنا چاہا۔ قدرت اور فطرت کی معصوم نشانیوں کی مدد سے، جو عقائد اور مذاہب ابھی تک رائج ہیں سب میں کچھ نہ کچھ اپنی اصلی حالت سے انحراف ہے۔ اگر فطرت کی عصمت سے خالقِ کائنات کا آئینہ بنے گا، تو آپ سمجھ لیجیے کہ وہ کون سا آئینہ ہوگا، کیا یہ دینِ ابراہیم کا آئینہ نہ ہوگا؟

یہ نظم اسی مقام پر ختم ہو سکتی تھی، مگر شاعر کے دل میں انسان کی عظمت کا

ہے، وہ کیا کرے، زمین اس کو راس نہیں آتی، آسمان کا سہارا بھی نہ رہا کہ مجبوروں کا آخری سہارا خدا ہی فنا ہو چکا ہے، اب اسے جو فرد شوں کی گندمی دنیا کو ہی حقیقت بنا پڑے گا۔ خیر کے عوض شر سے نبھانا ہوگا جس طرح دنیا ہر اعتبار سے ترقی کر رہی ہے اور انسان ترقی کرتا جا رہا ہے، اسی طرح شاید خدا بھی ارتقا پذیر ہوگا، اس لئے امید ہے کہ جلد ہی انسان پھر خیر کی طرف رجوع کرے گا، اپنے خدا کی طرف رجوع کرے گا جس خدا کو اس نے مار دیا ہے، بیکار کر دیا ہے جس سے وہ انکار کر رہا ہے، اس کی خدائی کو، اس کی طاقت کو اور اس کی ضرورت کو بالآخر محسوس کرے گا، انسان ایک خدا سے اکتا کر لاکھوں خدا بنا چکا تھا، مگر ان بے شمار خداؤں سے بھی اس کی ناآسودہ فطرت، آسودہ نہ ہو سکی۔ اس نے ان سب کو ختم کر دیا اور اس خدا کو بھی مار دیا جس کی طاقت کے مظاہر نے مختلف خداؤں کا روپ دھارا تھا۔

کلیم صاحب، ہارڈی کے طریق فکر سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، ہارڈی انسان کو تقدیر کے ہاتھ کا کھلونا سمجھتا ہے، لیکن وہ انسانوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ رہنے کی تلقین نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ تقدیر ہی تدبیر کی گرہ کھول دیتی ہے، گرچہ اپنی شہرۂ آفاق ناول Tess میں وہ مایوسی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور یاس اور حزن میں انسان، انسان اور خدا کے رشتوں پر بھی غور کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خدا سے اس حد تک بیزار ہو جاتا ہے کہ اس کا انکار بھی کر بیٹھتا ہے، اس لئے ایسے فلسفہ حیات رکھنے والوں کو خدا کی بابت سوچنا بلکہ سوچتے رہنا ہوتا ہے۔ ہارڈی نے اس طرح کئی نظمیں لکھ ڈالی ہیں، جن میں دو کا حوالہ تو ۴۲ نظمیں، میں آچکا ہے۔ یہ نظم ہارڈی کی نظم گوڈس فیونرل Gods

احساس ہے، وہ اس کی خلافت کا قائل ہے۔ وہ اس کی صلاحیت کا معترف ہے۔ اس لئے آخر میں اس بُت کی زبانی کہلوا دیا کہ انسان اگر غور سے دیکھے کہ اس کے چھرائے ہوئے چہرے میں، اس کی نعل وزمرّد کی رگیں، شاخ در شاخ جو پھیل گئی ہیں ان کی جڑیں کہاں پیوست ہیں؟ کس کے دل میں ہیں یہ پوشیدہ ذرا دیکھو تو، وہی تو انسان کا دل ہے۔ جس نقطہ سے ابتدا کی تھی۔ شاعر اسی نقطہ پر انتہا بھی کرتا ہے اور اسی لئے یہ نظم یہاں پر ختم ہوتی ہے:

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی
اہل نظر بھی ہم کو معبود جانتے ہیں

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم ؛ کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

ایک نظم سی۔ ڈے۔ لیوس (C. Day Lewis) کی ہے۔ دی سٹنگ (The sitting) کلیم صاحب نے اس نظم سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی نظم ہے، بڑی پیاری، بڑی معصوم، لیوس نے ابتدا میں جو انداز اٹھایا ہے۔ کلیم صاحب نے اس سے الگ ہو کر اپنے رنگ میں تمہید پیش کی ہے، لیوس کے یہاں وہ دیوتا ہی بولتا ہوا سامنے آتا ہے۔ مگر کلیم صاحب نے دور سے دیوتا کو دیکھا ہے، اس انداز سے فطری پن میں کمی تو آگئی۔ لیکن منظر نگاری کا موقع آ گیا اور ایک انسانی تجربہ کے بیان کرنے سے جو صداقت ہاتھ آئی وہ لیوس کو میسّر نہ آسکی:

So like a god I sit here,
One of those stone dreamers quarried from solitude,

A genius—if ever there was one—of the place :

اس کے بعد یہ مصرعے پڑھیے :

کوہ کی رفعت پرواز ذرا دیکھو تو
دور جو پست زمیں سے اٹھ کر
کچھ ستاروں سے کہا کرتی ہے
آج اس سر بفلک چوٹی پر
دیکھو تو عرش بریں سے کس نے
دیوتا لاکے بٹھایا ہے یہاں

ضرورت ہے کہ ایلیس کی پوری نظم پڑھ لی جائے، تب یہ نظم اچھی طرح ذہن نشیں ہو سکتی ہے، کیسے کیسے استعارے، کیسی کیسی تشبیہیں کلیم صاحب نے استعمال کی ہیں اور کہاں تک ان میں جدّت و ندرت ہے، یہ بھی آشکارا ہو جائے گا کہ انگریزی کی جامعیت کو اردو کی وسعت میں کس طرح سمیٹا گیا ہے۔ کلیم صاحب کی قوتِ پرواز ایلیس کی طرح محدود نہیں ہے، وہ فرد، جماعت، معاشرہ زمین، آسمان ہر جگہ کی سیر کرتی ہے :

And the god asks, "what have I for you
But the lichenous shadow of thought veiling my
temple,
The runnels a million time-drops have chased on
my cheek ?"

اب یہ مصرعے ملاحظہ کیجئے:

ہاں کہو کون سا میں راز بتاؤں تم کو
کون سا جلوۂ نا دیدہ دکھاؤں تم کو
ارے کیا کہتے ہو، کیا مانگتے ہو
میرے دریا میں صدف کوئی نہیں

وقت کے قطرے جو ہر لحظہ گرا کرتے ہیں
جو ازل سے ہی گرا کرتے ہیں
وہ مرے اُبھرے ہوئے گالوں میں
جھرّیاں دیکھو بنا دیتے ہیں

اب انسان کا جواب سنئے:

And the man replies, 'I will show you the creed of
your bone, I'll draw you
The shape of solitude to which you were born'

اس برہمن نے کہا: لو یہ مرا آئینہ
کیسا شفّاف بھی، روشن بھی ہے
دیکھو اس میں رُخ زیبا اپنا
اپنے رخسار کی یہ گہری لکیریں دیکھو
استخواں دیکھو یہ بکھرے اُبھرے
اور لبوں کی یہ خموشی دیکھو

اور یہ صورتِ تنہا دیکھو

Brushed by an eagle's wing; and a voice bids me speak, But I cannot speak'.

جی میں آتا ہے کہ کچھ میں بھی کہوں

لو زباں میری تو کھلتی ہی نہیں
دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے
بات کچھ ہونے نہیں پاتی ہے

The god thinks, let him project, if
He must, his passionate shapings on my stone heart.

سوچتا ہوں وہ برہمن میرا
کیسا فن کار ہے، صدفن بھی ہے
شعر رنگیں بھی ہے شاعر بھی ہے
آئے قندیل بیاباں کو فروزاں کرنے

میرے اس اُجڑے ہوئے مندر میں
میرے سنسان کلیساؤں میں
سونے سونے سے ان ایوانوں میں

دیوتا بن کے وہ بیٹھے، وہ رچائے محفل
میری پر نور شعاعوں کو وہ اپنا کر لے

Let him make, if he will, the crypt of my holy mountain

His own: let even the light
That bathes my temple become as it were an active
Property of his sight

اے مرے برہمن فن کار عظیم
حُسن کاری کو جگاؤ تو ذرا
اپنی صناعی دکھاؤ تو ذرا
اپنے سبزوں کے زمرّد لیکر

آؤ اس پھیلے ہوئے کہرے میں
اک نئی قوس قزح چھلکاؤ

اپنی ہشیار نظر سے تم نے
میرے رخسار کی دھندلی سی جھلک دیکھی ہے
ہوش کی شمع جلا کر تم نے
حُسن کی میرے یہ بھٹکی سی کرن دیکھی ہے

O man, O innocent artist
who paint me with green of yourfields, with amber or yellow
of love's hair, red of the hearts blood, eyebright blue
conjuring forms of rainbows out of an empty mist.

اس نظم کا اختتام بھی لیوس کی نظم کے اختتام سے ملتا جلتا ہے، خصوصاً یہ مصرعے :

یہ زمرّد کی رگیں
لعل و نیلم کی رگیں
شاخ در شاخ جو ہیں پھیلی ہوئی پھیلی ہوئی
ان کی رنگین جڑیں

کس کے دل میں ہیں یہ پوشیدہ ذرا دیکھو تو

اور اب The sitting کا آخری ٹکڑا پڑھیئے :

Your hand is upon me, as even now you follow
up the immortal clue
Threading my veins of emerald, topaz, amethyst,
And know not it ends in you.

یہاں پر آخری ٹکڑا ختم ہونے کے بعد قارئین کے ذہن میں کوئی خاص بات سوچنے کی نہیں رہ جاتی۔ برخلاف اس کے کلیم صاحب نے اپنی نظم کو استفہامیہ جملہ پر ختم کر کے پڑھنے والوں کے ذہن میں ارتعاشی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

فکر و نظر کی یہ دعوت ایک خاص حلاوت رکھتی ہے اور رفتہ رفتہ اس غربت کے پردہ میں انسان اپنی عظمت کو جلوہ گر دیکھنے لگتا ہے۔

---

(۱۸) ۱۷۳ مصرعوں پر محتوی یہ نظم حیات کے ایسے فلسفہ کو ہمارے سامنے لاتی ہے، جو واقعی بھی ہے اور یقینی بھی۔ دنیا کی بے ثباتی اور انسان کے فنا کا نقشہ ہر زمانہ میں، اور ہر زبان میں پیش کیا گیا ہے کہ موت ہی ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس سے کسی مذہب نے انکار نہیں کیا اور نہ کسی ملحد کو ہی انکار کی ہمت پڑ سکی۔ اس کا اظہار طبائع کے تفاوت کے ساتھ ساتھ متفاوت طور پر ہوتا رہا ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی ہو۔ اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے اور اگر شاعر خود بھی محروم اور منقبض رہا ہے، تو یہ فلسفہ اس کی زبان پر اور بھی تیز و تند ہو کر آتا رہتا ہے۔ حضرات صوفیہ کے اشعار میں موت کا ذکر اخلاقی تربیت اور تزکیہ روح کے لئے بھی ہوا کیا ہے کہ دنیا کی بے ثباتی کے ایقان سے انسان اپنی حیات ہی کو اپنی حیات کا مقصد نہیں سمجھ بیٹھتا ہے، وہ دنیا کو مزرع آخرت سمجھ کر عمل خیر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس فلسفہ میں غلو نے انسانوں کو اس طرح فنا آشنا کر دیا کہ وہ فنا کا شکار ہو کر بیکار سے ہو گئے۔ اسی لئے اقبال نے ناپائداری کائنات کا نقشہ اس طرح نہیں پیش کیا ہے کہ آدمی، موت کی منتظری میں اپنے دن کاٹ دے۔

اردو شعرا میں سبھی نے زندگی کی بے مائگی اور انسان کی فنا کا ذکر کیا ہے۔ خواہ کوئی نشاط و ابتہاج کا شاعر ہو، خواہ یاس و اضمحلال کا شاعر ہو:

موت سے کس کو رستگاری ہے ∴ آج وہ کل ہماری باری ہے

میر نے اس مضمون پر ایک مختصر مگر جامع قطعہ بھی لکھا ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا ∴ یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ∴ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

اس قطعہ نے شاعر کو ہر طرح اور اچھی طرح متاثر کیا ہے۔ جوش نے بھی اپنی نظم 'غمگین صدا' میں اس قطعہ سے تاثر کا اظہار کیا ہے:

آرہی ہے یہ ترتبوں سے صدا ∴ بچو! راس آئے تم کو خوش رہنا
چرخ ہستی پہ تھے ستارے سے ∴ ہم بھی تھے ایک دن تمہارے سے

اثر پذیری آشکارا ہے، مگر اثر انگیزی کا پتہ نہیں۔ میر نے ایک تجربہ ایک حقیقت پیش کی ہے۔ جوش نے ایک خیال اور ایک روایت بیان کی ہے — ہاں تو اس مذکورہ بالا نظم میں شاعر نے ایسے سارے خیالات کو، اپنے تخیلی تجربات میں ملا کر مربوط و منظم کر کے تدریجی ارتقا کے ساتھ بیان کیا ہے اتنے سارے منتشر اور مختلف خیالات و تجربات کو صداقت کی وحدت میں بدل کر شاعر نے مجموعی طور پر بے ثباتی دنیا کے ذکر سے خستگی اور جمود پیدا نہیں کیا ہے موت کے ذکر کے بعد دبدبہ اور جاہ و حشم کا ذکر کر کے عبرت تو دلائی ہے، مگر انقباض پیدا ہونے سے روک دیا، میر نے عبرت اس انداز سے کی ہے کہ آدمی مجبور ہو کر رہ جائے اور شاید زیست سے بیزار بھی ہو جائے، راستہ دیکھ کر چلنے کی ہدایت معنویت سے بھری ہوئی ہے۔ دنیا میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا دانشمندی اور کامیابی کی دلیل ہے، — اس نظم میں عبرت و نصیحت کچھ ایسے چبھتے ہوئے انداز میں تو نہیں۔ لیکن زندگی کی رعنائی و برنائی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ چونکہ نظم طویل ہے

اس لئے وہ کلیجہ کو چکیوں میں مسلنے والا انداز جو میر کا ہے، پیدا نہ ہو سکا، حسین الفاظ، حسین مرقعے، رنگین بیان اور رنگین تجربے حیات کو حسین اور رنگین بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ موت اور فنا کوئی جذبہ غمگین نہیں رہ پاتا، اس جہد و عمل کی دنیا میں، تنازع علی البقا کے دور میں، بقائے اقویا کے ماحول میں زندگی کو جامد و خامد بنا کر شاید یہ دنیا مزرع آخرت بھی نہ بن سکے۔ اس لئے یہاں فنا کا ذکر ہے۔ مگر اہتزاز کی روح لئے ہوئے ہے، مرنے والا تو مر جاتا ہے۔ مگر اس کا اثر سارے عالم پر باقی رہتا ہے۔ اس کے حسن سے کائنات بہرہ مند ہوتی ہے۔ اس کی درخشانی سے ستارے مستفیض ہوتے ہیں۔ چمن میں نکھار اس کا پرتو بن جاتا ہے، صبح، شام، رات، ہر سماں پر اس کا اثر چھا جاتا ہے، ایسی موت، موت کم اور زندگی زیادہ ہے اس سے پژمردہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی موت تو عشرت قطرہ ہے اور یہ قطرہ سازِ انا البحر کی ترنگ سے لہریں لے رہا ہے۔ اور جب ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا اور ہم اس کی روح ہیں، اس کی صورت ہیں، تو پھر ہماری موت کس طرح ہمیں دنیا سے محو کر اسکتی ہے۔

اس نظم کے تین حصے ہیں۔ نظم ذرا طویل ہے اور یہ طوالت کہیں کہیں عیب بن گئی ہے۔ لیکن آخری حصے نے اس طوالت کا جواز پیش کر کے اس عیب کو ہنر میں تبدیل کر دیا ہے — ایک انسان کسی حسینہ کا کاسۂ سر لئے ہوئے عالم فکر میں پڑا ہوا ہے۔ اس استخواں کو دیکھ کر، وہ استخواں والی کے حسن، اس کی رعنائی کو یاد کرتا ہے، اس کی صبح سی چمکتی ہوئی پیشانی، اس کے شب رنگ گیسو اور اس کی عنبر سارا خوشبو، اس کے لعل لب اور نرگسی آنکھوں کو

یاد کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک حد تک شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' سے متاثر ہے۔ 'زہرِ عشق' میں یہ سارے بیان، موت اور فنا کا نقشہ تو پیش کرتے ہیں مگر مقصد تسکین جذبۂ جنس ہے۔ اس سے کوئی تعمیری کام نہیں لیا گیا ہے۔

دوسرے حصّے میں استخواں کا جواب ہے:

یہ کون ڈھونڈتا ہے میری زلفِ پُرخم کو
ارے اس کے چم خم تو ساری کائنات پر چھا گئے ہیں:
انھیں کی بو سے مہکتا ہے عنبر سارا
انھیں میں کھاتے ہیں بل ناگ کالے کالے سے

یہ سارے حسینانِ جہاں اسی کے حسن سے حسین کہلاتے ہیں:

جو سمجھو تم تو ان آنکھوں میں میری آنکھیں ہیں
جو دیکھتی ہیں تو میری نظر سے دیکھتی ہیں

وہ کاسۂ سر اپنے حسن کو لازوال بتا کر آخر میں یہ کہتا ہے:

یہ لعلِ لب، یہ مرا لالۂ گل رخسار
بھلا اجل کے مٹائے کہیں یہ مٹتا ہے

وہ چیز ختم نہیں ہوئی ہے، موت نے اس کو فنا نہیں کر دیا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ نظر چاہیے بینا، وہ دنیا میں ہے آنکھ کھول کے دیکھو، وقت کا دائرہ گھماؤ، یہ دائرہ تو گھوم ہی رہا ہے۔ یہ دائرہ ذرا کج ہے۔ کجی پر نظر کرو۔ ساری چیزیں نظر آجائیں گی۔ غالب نے اسی فلسفہ کو تصوف والے انداز میں بیان کیا ہے: ؎

سب کہاں کچھ لالۂ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

Funeral کا پرتو ہے جس میں سترہ اسٹینزا ہیں۔ پہلا مکرا یہ ہے:

I saw a slowly-stepping train
Lined on the brows, Scoop-eyed and bent and hoar
Following in files across a twilight plain
A strange and mystic form the foremost bore

کلیم صاحب کی نظم کا پہلا مکرا ملاحظہ ہو:

یہ کس کا جنازہ اٹھ رہا ہے

افسردہ فضا، ہوا ہے خاموش
غمگیں بادل ہے رعد خاموش
بجلی کی چمک ہے دھیمی دھیمی
موجیں اٹھتی ہیں سوئی سوئی
خاموش شجر، حجر بھی خاموش
ہنگامہ بحر و بر بھی خاموش
دنیا لگتی ہے سونی سونی
یہ راہ ہے کیسی کھوئی کھوئی
خاموش زمیں، فلک ہے خاموش
سورج لو! ہو رہا ہے روپوش

بادی النظر میں یہ نظم خدا کا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر غور کیجئے، تو پتہ چلتا ہے کہ شدتِ احساس اور تندی ایمان نے یہ جلے کٹے جملے کہلوائے

یہ خیال وجود انسان، موت کا رخ پلٹ سکتی ہے اور یہی فلسفہ ہے جس کی ضرورت انسانیت کو ہے :

یہ قمقمے ہیں کہ جن کے بدلتے رنگوں سے
سجائی جاتی ہیں قوس قزح کی محرابیں
دھنک جھلکتی رہے گی فضائے رنگیں سے
یہ قمقمے بھی بناتے رہیں گے محرابیں
دھنک ہے باقی مرے قمقمے بھی باقی ہیں
ذرا گھماؤ تو اس دائرے کو پھر دیکھو
وہ میری زلف مسلسل، وہ میری صبح جبیں

---

(۱۹) یہ نظم قدرے طویل ہے۔ اس میں ۲۳۰ مصرعے ہیں۔ ان میں شاعر نے ایک نیا تجربہ اور ایک نیا خیال اردو شاعری کو دیا ہے۔ کلیم صاحب نے اپنی تصنیفات میں اس نظریہ کی بڑے شد و مد کے ساتھ تردید کی ہے کہ جتنے تجربات اور جتنے خیالات کوئی شاعر بیان کرتا ہے، وہ سب اس کے ذاتی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ کسی بھی انسان کے لئے ناممکن ہے کہ وہ بیک وقت متنوع اور متضاد تجربات کا حامل ہو۔ شاعر کا کمال اس میں نہیں ہے کہ سارے تجربات اس کے اپنے ہوں۔ بلکہ اس کا کمال اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اتنے گوناگوں اور متباین تجربات کو کس حد تک تخیلی حقیقت بنا کے پیش کیا ہے۔ اسی سے شاعر کے خلوص اور جوش کا پتہ چلتا ہے۔ مذکورہ نظم بھی اسی قبیل کی ایک علامتی نظم ہے، میتھو ارنلڈ تو کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ شاعری اظہارِ شخصیت نہیں۔ بلکہ نفی شخصیت ہے۔ لیکن ایک بڑا شاعر ہی جانتا ہے کہ نفی شخصیت میں کامیاب ہونا آسان کام نہیں۔ یہاں شاعر نفی شخصیت کو مکمل طور پر برقرار رکھ سکا ہے۔

اس میں ایک آدمی کی دیوانگی کی کہانی ہے، یہ انسان بستر مرگ پر ہے اور لوگ اس کے مرجانے کو یقینی سمجھ چکے ہیں۔ موت کے وقت اعزہ واقربا تلقین ایمان کرتے ہیں اور تحریک توبہ، لوگ اس کے گزشتہ گناہوں کا اشارہ کنایہ میں ذکر کرکے آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ وہ ساری باتیں سُن لیتا ہے اور اس کو اپنے بیتے ہوئے دنوں کی یاد آجاتی ہے۔ پرانے زخم ہرے ہو جاتے ہیں اور ان زخموں کے ٹانکے ناصحوں کی نصیحت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ دل کھول کر پچھلی باتوں کو، بھولی بسری داستان کو، مسرت وکامرانی کے ایام کو یاد کرکے مضطرب ہو جاتا ہے اور سارے راز فاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حاضرین اس کی توجہ دوسری طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں۔ مگر جو بھی اس کو روکنا چاہتا ہے۔ وہ ان کو ان کی پرانی محبت اور ان کے رنگین گناہ کو یاد دلاتا ہے۔ وہ روکنے والے کو صاف دوٹوک یہ کہہ دیتا ہے کہ تمھارے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش ہوا تھا۔ جب اس کا دل بھر جاتا ہے، تو دوا پی لیتا ہے۔ دوا اس لئے نہیں پیتا ہے کہ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ بلکہ اس لئے پیتا ہے کہ اگر صحت مند ہوا اور اس فرصت کم والے مقام میں اگر مہلت ملی، تو پھر وہ شمع الفت کو فروزاں کر سکے گا اور داد محبت دے سکے گا۔ اس محبت کے بیمار کو جس کی حالت ہجر محبوب میں ایسی غیر ہوگئی ہے۔ کسی پہلو قرار نہیں آتا، دوا پی لینے کے بعد بھی وہی سب خیالات اس کے

لرزتے ہوئے پردہ ہائے دماغ پر تھرتھرانے لگتے ہیں اور حاضرین میں سے ایک ایک کا بھید ظاہر کر دیتا ہے۔ اس پر بھی اس کے اعصاب کو سکون نہ ہوا اور وہ جنسی ہیجان جس کا وہ مرض الموت میں بھی شکار ہے اور کبھی کھل کر ظاہر ہو جاتا ہے وہ ایک حسرت آگیں ماحول میں، ایک کیف پرور اور لذّت انگیز ذکر کر کے اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ تا کہ سارے گناہوں کا اعتراف کر کے وہ توبہ کرے صدق دل سے —— دوا نے کوئی اثر نہ کیا۔

موت سے دیکھو بچا ہے کوئی
موت کی دیکھو دوا ہے کوئی

جو کہا تھا، وہ صحیح نکلا اور وہ مر گیا:

شب ہجراں کی سحر ہو کے رہی
جاگنے والے کو نیند آ ہی گئی

جو شاعر کہنا چاہتا ہے، وہ اس نظم سے واضح ہو جاتا ہے۔ نہ الفاظ کے جال ہیں اور نہ رعب انگیز فقرے اور تراکیب کی فوج ہے، مصرعے سادہ ہیں، الفاظ براہ راست مطالب ادا کر رہے ہیں، بعض مصرعے تو شاعری کی نادر مثالیں ہیں:

مثل بو گل سے نکل آئی تھی
مے تھی ساغر سے چھلک آئی تھی

اِک کلی تھی، جو کھِلا چاہتی تھی
پھول بننا تھا، بنا چاہتی تھی

آہ! دریائے معاصی میرا
کیا تنک آب تھا پایاب ہوا

آخر الذکر دو مصرعوں پر اس شعر کی مہر ثبت ہے۔ ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ؛ میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

عید کے دن سارے خویش و اقارب سے نظر بچا کر، رات کو اس غنچۂ نورس کا اپنے چاہنے والے کے پاس آنا کوئی انوکھا اور نیا تجربہ نہیں۔ لیکن اس لڑکی کا آنا اور اپنے ساتھ اپنی ساری معصومی کو قربان کر دینا یہ ضرور ایک نیا تجربہ ہے۔ اور شعراء عام طور پر بازاری عورت سے اس طرح کے اختلاط کا ذکر ڈنکے کی چوٹ کیا کرتے تھے، مگر یہاں اس کے برعکس دیکھنے میں آتا ہے۔ عید کے دن کو معراج کا دن کہنا اور پھر جو نہ ہونا تھا وہ ساری باتیں کر گذرنا، محض اس رعایت سے کہ معراج میں وصل حبیب میسر ہوا تھا میرے خیال میں پڑھنے والوں کو چونکا دینے والا خیال ہے۔

اختلاط کی لذت و کیفیت کو تو کنایہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن دواعی اختلاط کو پھر چھا کر، بیان کرنا بھی اس مصلحت کا تقاضا تھا کہ جن باتوں کے بیان کرنے کے بغیر خیال ادھورا رہ جائے۔ ان کو تو ضرور بیان کیا جائے۔ ورنہ ایسے بیانات، جن کے بغیر خیال مکمل ہو سکتا ہے، ان کا بیان نہ کرنا ہی آرٹ ہے۔

اس نظم کا ایک بند جس کی ابتدا اس مصرع سے ہوئی ہے:

'ہاں میں کہتا تھا مجھے کہنے دو'۔ بظاہر بیکار معلوم ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے جنسی ابھار والے خیالات کو بے ضرورت طول دینا، معصوم دماغوں کو اپنی جگہ سے پھسلا دینا ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ غریب، وہ عاشق مہجور تو دیوانہ ہے۔ دیوانہ کو تو ہوئے بس است:۔ ذرا سا ذکر آیا، سارے جذبات اس کے نہاں خانۂ دل سے بلبلا کے

نکل آئے۔ اس میں شاعر بھی مجبور تھا۔ اور اپنی ترنگ میں سب کچھ کہہ گیا اور عشق کی تکمیل بتا گیا، اس نے وہی کیا، جو نواب مرزا شوق نے بیگم کو رام کرنے کے لئے کیا تھا، عریانی یہاں بھی ہے اور عریانی وہاں بھی، عریانی بذات خود کوئی نئی چیز نہیں اور کوئی بری چیز بھی نہیں، اگر فن کار عریانی کو لذت اندوزی کر کے رکھ دے تو یہ قطعاً عیب ہے اور اگر یہی عریاں نگاری زندگی کے کسی مسئلہ کو سمجھنے میں اور حیات کی عکاسی میں مدد کرتی ہے، تو یہ ہُنر ہے۔ شوق کا مقصد حیوانی جذبہ کی تسکین ہے اور عریانی اصل مدعا، مگر نظم مذکورہ صدر کے شاعر نے اس عریانی کو ایک نفسیاتی الجھن اور ایک اندرونی کیفیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے یہ مقام عریاں ہوتے ہوئے بھی عریاں نہیں ہے۔

اس نظم پر براؤننگ کی نظم دی کنیفشنز (The confessions) کا پورا اثر ہے۔ کینفشنز ۳۶ مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ جس میں ایک انسان جو مرض الموت میں گرفتار ہے، ایک پادری کے سامنے، اس پادری کے سامنے جو 'مجاذب گناہ' سمجھا جاتا ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں اکثر جنسی کجروی کا ذکر ہوتا ہے۔

براؤننگ تو ایک مکمل فنکار ہے۔ اس لئے مرتے ہوئے انسان کی زبان سے صرف اشارے اشارے میں ہر طرح کا اقرار کر لیتا ہے اس کا بیان طویل بھی نہیں کہ مرتا ہوا انسان اتنی مہلت کب پاتا ہے اور پادری کی موجودگی میں ایک سنجیدہ ماحول بھی پیدا کر دیا جاتا ہے۔ سنجیدگی برابر برقرار رہتی ہے۔

And stood by the rose- wreathed gate Alas
we loved sir,—used to meet:

How sad and bad and mad it was—
But then how it was sweet

شروع ہی سے اس آدمی کو اس کا احساس ہے کہ وہ مر رہا ہے اور اب اس کا موقع نہیں کہ کوئی عریاں اور فحش بات زبان سے نکالے ساتھ ساتھ اس کو سارے گناہ کا ذکر بھی کرنا ہے۔

At a terrace, some what near the stopper
There watched for me, one june
A girl: I know sir, it's improper
My poor mind's out of tune

کلیم صاحب نے اس نظم کو ذرا طول دیا ہے اور باتیں بھی عریاں و بے نقاب کرکے بتائی ہیں۔ جس کا بظاہر کوئی موقع نہ تھا، وہ آدمی بھی مر رہا ہے۔ اس کو بھی اپنی عزت کا احساس ہے۔ وہ بھی ایسے ماحول میں ہے، جو اعترافات گناہ کی فضا پیدا کر چکے ہیں۔ موت کے وقت انسان کو چپ سی لگتی جاتی ہے۔ یہ سب تجربات بر بنائے حقیقت نہیں معلوم ہوتے ــــ مگر سوچیے کہ یہ آدمی تو پاگل ہے پاگلوں پر کوئی پابندی نہیں اور پاگل پن میں خصوصاً اس طرح خلل دماغ والے دیوانوں میں قوت و حافظہ کی ساری رگیں ابھر جاتی ہیں اور انھیں چھوٹی بڑی ساری باتیں یاد آتی رہتی ہیں۔

---

(۲۰) ۱۷۰ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم اردو شاعری کا ایک نیا باب کھولتی ہے یہ مختصر ہے اور اس کو مختصر ہونا چاہیے، اس میں ایک طوائف کی زندگی کا ایک رخ

پیش کیا گیا ہے۔ مگر یہی رخ اس کی زندگی کا اہم اور بنیادی مرکز ہے۔ رنڈیوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جذبی اور فاسمی کی نظم طوائف اور ساحر کی نظم چکلے، اخلاقی اعتبار سے تلملا دینے والی نظمیں ہیں۔ رنڈیوں کے افسانے منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب ان کی زندگی کو ایک نئے زاویے سے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان کو سنجیدگی اور زہد و تقویٰ کے معیار پر جانچتے ہیں۔ ایسے ادب پارے زیادہ تر اشتراکی طریقۂ حیات سے متاثر ہیں اور سبھی فن کار نے رنڈی کو اپنی حال کی زندگی سے بیزار دکھایا ہے۔ کسی نے اس کے پیشہ ور بازاری عورت بن جانے کے جواز میں یہ بتایا کہ وہ بھوکی تھی، پیٹ بھرنے کے لئے اپنے جسم کو فروخت کرنے کا بیوپار بنا لیا۔ کسی نے یہ کہا کہ یہ عورت سماج کی ٹھکرائی ہوئی تھی۔ یا یہ کہ کوئی اس کو بہلاوے دے کر لے آیا اور پیشہ کرانے لگا، ورنہ وہ اس پیشہ سے نفرت کرتی ہے۔ یہاں پر مجھے اس سے بحث کرنا نہیں ہے کہ شکم پری کے لئے بدکرداری اور جسم فروشی قابل برداشت بھی ہے یا نہیں۔ یہ سارے آرٹسٹ عورت اور حسین لڑکیوں کی بعض نفسیاتی پیچیدگی سے آگاہ نہیں ہو پاتے، انھیں ساری چیزوں کو پروپگنڈا کے طور پر پیش کرتا ہے اور ایسا کرنے میں قطعاً لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں اور رجعت پسند ہوتے ہوئے بھی روایتی انداز فکر سے ان کی رگیں تنی رہتی ہیں۔ کسی شاعر یا نثر نگار نے یہ بتانے کی جرأت نہ کی کہ یہ بازاری کسبیاں اپنے پیشہ سے اس طرح خوش رہتی ہیں۔ جیسے ایک بھنگی اپنے کام سے، یا ایک تاجر اپنی تجارت سے اور ایک آفس کا نوکر اپنی نوکری سے۔ یہ کسبیاں اگر اپنی زندگی میں نا آسودگی کا شکار ہو جائیں، تو پھر ان کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔

اس نظم میں اسی طرح کا ایک تخیلی تجربہ ہے کہ کس طرح یہ کھلاڑی عورتیں اپنے حسن عریاں کو عریاں کرکے دوسروں کے حوالے کر دینے میں ایک سکون محسوس کرتی ہیں۔ آخر ان کو زندہ تو رہنا ہے۔ اب زندگی برقرار رکھنے کے لئے جو کام بھی کریں۔ ایسی عورتیں اپنے وجود کو سماج کے ماتھے کا برص اور معاشرے کا کوڑھ نہیں سمجھتی ہیں۔ یہ کہانی ہے ایک تجربہ کار رنڈی کی جس کی ایک لڑکی ہے، یا تو اس کی اپنی بیٹی ہے۔ یا منہ بولی بیٹی ہے، (اس نظم میں کوئی چبھتا ہوا اشارہ اس کی طرف نہیں ہے کہ وہ لڑکی اس رنڈی کی بیٹی ہی ہے) پختہ کار اور سن رسیدہ طوائف اپنے اردگرد اس قسم کی لڑکیوں کی فوج رکھا کرتی ہیں اور ایک رات جوان کے سہاگ کی پہلی رات ہوا کرتی ہے، ان کو حجلۂ عروسی میں بناسنوار کے کسی موٹے اسامی کے جنسی سکون کے لئے بھیج دیتی ہیں اور معلوم نہیں یہ رسم ایک لڑکی کی کتنی بار ہوتی ہے، ہاں تو کہانی اسی طرح کی ایک رات کی ہے کہ وہ لڑکی اس تصور سے کہ آج ملاقات کی پہلی رات ہے۔ جانے کیا واردات پیش آئیں سہمی ہوئی، بلکی بلکی اور چپ چپ سی ہے، یہ اس کا نیا تجربہ ہوگا، ممکن ہے اس کی فطرت اس گھناؤنی زندگی میں رہنا پسند نہ کرتی ہو۔ اس کی ماں نے تاڑ لیا اور اس کو طرح طرح سے سمجھایا، سمجھایا کیا بلکہ ہر بات سے، ہر گھات سے اس کی جنس کی پکار کو آواز دیتی رہی۔ اس نے بڑے ہی عام انداز میں اس لڑکی کو کہہ دیا کہ مقصد تخلیق عورت یہی ہے کہ کسی گود کی زینت بنے اور بنتی رہے اور ایسی ایسی باتیں کہیں کہ اس کی بدفطرت جگ جائے اور نیک فطرت سو جائے۔ باتیں کرتے کرتے خود اس عورت پر ایک سرور سا طاری ہو گیا اور اس کی باتوں نے خود اس کی رگوں کو جھنجھنا کے

رکھ دیا، ــــــــ اس نے اپنی بیتی ہوئی زندگی کی کہانی کہنی شروع کر دی۔ کچھ تو اس لئے کہ اس لڑکی کے احساسِ حسن، احساسِ شباب میں کوئی کسر باقی نہ رہے اور ہر طرح اس کو استعمالِ حسن اور استعمالِ شباب پر مجبور کر دے اور کچھ اس لئے کہ وہ اپنی بیتی ہوئی بہاروں کے دن یاد کر کے کم از کم ذہنی طور پر تو اپنی تسکین جنس کا سامان کرے کہ ان پیشہ ور عورتوں کا یہی مایۂ حیات ہے اور یہی ان کی کائنات ہے۔

اس عورت نے تین تصویریں پیش کیں، پہلی تصویر تو اپنے پہلے سیٹھ کی ہے جس سے پہلی ملاقات کی رات وہ بھی ڈری ہوئی تھی۔ مگر اس نے اس کو ہر طرح اپنے قابو میں کر لیا اور اس نے خود کو ایک والہانہ کیفیت کے ساتھ اس کے سپرد بھی کر دیا۔ اس نے اس کو۔ نیلم، لعل، زمرد، گوہر، مرمر کے محل اور زریں گلشن سب کچھ دیا اور اس نے ہنسی خوشی قبول کر لیا اور پھر وہی ہوا، جو ہونا چاہیئے تھا ــ دوسری تصویر ایک جوان رعنا کی ہے، جس کی مست نگاہوں نے اور جس کی بے باک اداؤں نے اس کو بیک نظر قابو میں کر لیا، وہ بے خوف چلا آیا اور:

جو ئے شیر اس نے بہائی مری جاں میں کیا کیا
میرا مجنوں بھی وہی تھا، مرا وامق بھی وہی

تیسری تصویر ایک مرد نو خیز کی ہے، جو اپنی معصوم نگاہوں سے اس کے بے بجۂ ہوس کی گرفت میں آ گیا، اس کی نا سمجھی اور اس کی بے خبری نے اس کو بھی اسی طرح کے احساس سے ہمکنار کر دیا تھا، بلانے پر وہ آ گیا اور اس بے خبر، کم سن اور نا فہم لڑکے کو کسی طرح جنسی عمل کے لئے تیار کر لیا اور:

نا شگفتہ سا جو غنچہ تھا، وہ کیا پھول بنا
کیسا نکہت کا تلاطم ہے، ذرا دیکھو تو

کیسا رنگوں کا تموج ہے ذرا دیکھو تو

ماں نے اپنا فرض انجام دے دیا اور اپنی کہانی سُنا کر اس کو اس بات کی تعلیم کر دی کہ وہ اگر اس کی بیٹی ہے، تو ضرور ماں کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گی اور چلتی رہے گی اور پھر یہ دنیا چلتی رہے گی اور یہ چکّر چلتا رہے گا۔

---

(۲۱) کلیم صاحب نے انسان کے اندر پوشیدہ امکانات کو کئی نظموں میں آشکارا کیا ہے، یہ نظم بھی اسی طرح کی ہے، مگر انسان کی عظمت یہاں فلسفہ کی روشنی میں دکھائی گئی ہے۔ اقبال کا 'مرد کامل' یہاں بھی صورت پذیر ہے۔ مگر یہ مرد کامل فطرت کی پیروی سے اُبھرتا ہے۔ ۱۵۱ مصرعوں کی اس نظم میں آدم کی جبلّی صلاحیت کو فلسفہ بنا کر نہیں بلکہ شعر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ امر دشوار ضرور ہے کہ ایسا خشک فلسفہ کس طرح شاداب شاعری میں منتقل ہو سکتا ہے۔ یہاں پر شاعر فلسفہ میں شاعری بھی کر گیا ہے اور شاعری میں فلسفہ بھی بتا گیا ہے۔ لیکن یہ باقاعدہ فلسفہ نہیں۔ اس لئے کہ ادب کو باقاعدہ فلسفہ نہیں بننا چاہیئے اس لئے کہ جو فلسفہ کا حسن ہے، وہ ادب کے لئے عیب ہے:

جو کانٹے نہ ہوں گل کو پھر کون سونگھے
جو پتّھر نہ ہوں کون ریشم سے لپٹے
جو ظلمت نہ ہو روشنی کون دیکھے
جو آنسو نہ ہوں کون پھر مسکرائے

یہ دنیا مجموعۂ اضداد ہے۔ یہی اجتماع اضداد اس کی زینت ہے۔ دنیا کے سارے جھگڑے بکھیڑے اسی تخالف و تضاد پر قائم ہیں۔ بلکہ دنیا خود اسی تضاد پر

ہیں، یہ پوری نظم ع

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کی سائنس اور عقلیت کی حد میں رہتی ہوئی تفسیر ہے۔ خدا کے بغیر دنیا کا کارخانہ چلا ہے اور نہ چلے گا، انسانوں نے تو اسی لئے ان گنت خدا بنا لئے تاکہ زندگی کے ان گنت شعبوں میں ایک سہارا حاصل ہوتا جائے۔

اک ذوق جبیں سائی نے ترے معبود بنائے چن چن کر
اے وعدہ فراموش ازلی وعدوں کی وفا کا نام نہ لے

یہ پوری نظم طنز کے زہرناک تیروں سے بھری ہوئی ہے، انسان کی پستی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی کہ اس نے اپنے زعم کے مطابق اصل معبود کو ہی کفنا دفنا کے رکھ دیا۔

دوسرے اور تیسرے ٹکڑے میں وہی سکوت اور اداسی ہے جس سے نظم کی ابتدا ہوئی ہے، ساری فضا پر ماتمی رنگ چھایا ہوا ہے۔ انتہائے غم نے حاضرین کو مجنوں سا بنا دیا ہے۔ ہر زبان خاموش، ہر آنکھ ویراں، ماتم میں بال کھولے گریباں چاک کئے ہوئے ہر متنفس دم بخود ہے، پھر یہ راز افشا ہو جاتا ہے کہ یہ جنازہ کس کا ہے، اس راز کے منکشف ہونے پر انسانی ردعمل ملاحظہ ہو:

انساں کا وہی تھا اک سہارا
مجبوروں کا آسرا وہی تھا
درماں تھا وہی تو درد دل کا
تریاق تھا زہر جانگسل کا

سچ ہے جس کو رشک ثریا ایوانوں میں اور مخملی گدوں پر آرام کرنا مقسوم

قائم ہے۔ یہ ایسا تجربہ ہے جو بدیہہ ہے، محتاج تشریح نہیں۔ یہاں پستی کے ساتھ بلندی ہے، زندگی کے ساتھ موت ہے۔ بہار کے ساتھ خزاں ہے، پھول کے ساتھ کانٹے ہیں، خواب ہے اور بیداری ہے۔ سردی ہے اور پھر گرمی ہے، زمین تو زمین، آسمان پر بھی وہی حال ہے۔ ثوابت ہیں اور سیارے ہیں، اضداد کے اس ظاہر و باہر تجربہ نے فلسفہ دانوں کو کچھ غور و فکر کی دعوت دی اور رفتہ رفتہ بعض نے زندگی کی ٹھوس حقیقت کا ایک ایسا فلسفہ دریافت کر لیا جس سے روح اور جسم کے باہمی رشتوں کے متعلق کچھ شکوک رفع ہو گئے۔ فنا اور بقا کا راز بھی منکشف ہو گیا اور حشر و نشر کی گتھی بھی عقلی حدود میں رہ کر سلجھتی نظر آنے لگی۔

مادہ پرستوں نے تو پہلے یہ کہا کہ مادہ نے دنیا بنائی اور مادہ ہی سب کچھ ہے۔ مادی جدلیات کا بنیادی عقیدہ تو یہی ہے کہ اس معروف دنیا میں مادہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن بعض سائنس دانوں نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ مادہ رفتہ رفتہ غائب ہو رہا ہے۔ اس لئے مادی جدلیات کے متوسلین، جو مادہ ہی کو اصل حیات مانتے ہیں۔ ان کا نظریہ جواب دے رہا ہے:

خلاؤں سے آگے بھی کوئی خلا ہے
شہنشاہ کیسا یہاں حکمراں ہے

مادہ ایک معروضی حقیقت ہے، جو ہمارے ذہن سے علیحدہ اور آزاد طور پر موجود ہے۔ اب جدید سائنس دانوں نے مادہ کے علاوہ ایک اور جوہر کا انکشاف کیا ہے جس کو وہ ضد مادہ Anti matter کہتے ہیں۔ یہ ضد مادہ بڑا ہی لطیف ہے سیال ہے، اگر یہ مادہ سے متصادم ہو تو مادہ فوراً فنا ہو جائے، یہ ضد مادہ

بھی ایک دیتا ہے، لیکن اگر ذرا بھی یہ دنیا مادہ سے چھو جائے تو مادہ ہوا ہو جائے۔ اس لئے ان کا یہ خیال ہے کہ یہی ضد مادہ اصل حیات اور سرتا سر حیات ہے۔ یہ علم ہی اصل زندگی ہے، علیین زندگی ہے، اگرچہ یہاں نہ ہوا ہے، نہ پانی، نہ مٹی، نہ آتش۔

شہنشاہ اعظم جو یہ حکمراں ہے
وہ قادر بھی ہے اور مختار بھی ہے
وہ مالک بھی ہے اور جبار بھی ہے
وہ اول بھی ہے اور آخر وہی ہے
جو حملہ کرے وہ مکاں لامکاں پر
تو تاراج پل میں مکاں لامکاں ہو

غور کیجئے کہ صور اسرافیل کیا شئی ہے اور پھر قیامت کس طرح آئے گی اور یہ ساری ہنستی کھیلتی اور بسی بسائی دنیا آن کی آن میں کس طرح مٹ جائے گی اس کا عقلی ثبوت فراہم ہو رہا ہے۔

اس عدم نے جو عدم نہیں اصل وجود ہے۔ یہی اصل ہستی نے مادہ بنایا، لیکن ایسا کرنے میں اس سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے اور مخلوقات کے ساتھ ساتھ آدم بھی بنایا ہے یہ سرشار بدمست غفلت تھی کیسی، نہ انسان بنانا تھا انسان بنایا، ایسا کرنے سے زندگی مادہ کے تابع ہوئی، تو مادہ نے بھی زندگی کو اپنے تابع بنا لیا، اس طرح انسانوں کے ارتقا کا مسئلہ اب حل ہونے لگا۔ اس ارتقا کے چکر میں ڈارون نے آدم کو بندر ہی بنا دیا۔ یہ عقلمند انسان اتنا نہ سمجھ سکا کہ محض حرکاتی مماثلت کی بنا پر انسان کو بندر کا ارتقا پذیر نمونہ کہہ دینا، انسانیت کی توہین ہے۔ پھر

جب آدمی بندر بن گئے، تو اب بندروں کا وجود تو ختم ہو جانا چاہیئے، پھر آخر وہ کون سا بندر تھا، جو خود ترقی کر کے انسان بن گیا اور اپنے قبیلہ والوں کو بندر ہی رہنے دیا ـــــ یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا ـ ہاں تو زندگی کی کوشش ہے کہ آزادی حاصل کرے ـ اس کا مقصد ہے کہ مادہ سے نجات پائے دنیا کی ساری تگ و دو کی یہی انتہا ہے، زندگی جب مادہ سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جائے گی ـ پھر کیا ہو گا اور کیا رہے گا، یہ سب سوچنے سمجھنے کی باتیں ہیں ـ

انسانی ارتقا کا مسئلہ حیات و کائنات کے لئے اتنا اہم اور ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ فلسفی اس گتھی کو برابر سلجھا رہا ہے ـ لیکن اس کو ابھی تک سرا مل نہیں پایا ہے، چونکہ فلسفی بحث و نظر سے کام لیتا ہے، بصیرت و عقیدت سے دور رہتا ہے اور یہ گتھیاں بصیرت و عقیدت کی بدولت سلجھ سکتی ہیں، ـــ ہاں اقبال نے بھی انسانی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے ـ اقبال کا فلسفہ مابعد الطبیعیات وحی والہام پر مبنی ہے، اس میں وجود باری، توحید، رسالت، حشر و نشر، خیر و شر وغیرہ کو عقلی دلائل کے بجائے اتحاد عمل سے ثابت کیا گیا ہے اور یہی طریقہ متکلمین فلسفہ دانوں کا تھا ـ وہ بھی ایک حقیقت کبریٰ کو مانتے تھے ـ

Ulti mate reality بنی نوع انسان کی ارتقائی تاریخ ہر موڑ پر ایک حق مطلق کی ضرورت محسوس کراتی ہے ـ یہ ارتقا تین حصوں میں منقسم ہو سکتا ہے اشیا پرستی، فطرت پرستی، وحدانیت، انسان رفتہ رفتہ پہلے دو ادوار سے گذر چکا ہے اور گذر رہا ہے، اب وہ وحدانیت کی منزل پر آ رہا ہے اور ضد مادہ کی دریافت اس منزل کی طرف ایک قدم ہے ـ

جارج برنارڈ شا نے انسانی تاریخ ارتقا پر روشنی ڈالی ہے ـ اس کا نظریہ

بھی اسی نظریہ سے ملتا جلتا ہے Back To Me thusaleh میں وہ کہتا ہے:

I am Lilith:- I brought life into the whirlpool of force and compelled my enemy, matter, to obey a living soul. But in enslaving life's enemy I made him life's master, for that is the end of all slavery; and now I shall see the slave set free and the enemy reconciled, the whirlpool became all life and no matter.

آپ اسے ارتقائے حیات انسانی کہیئے یا علامات روز قیامت، بات کچھ اسی طرح کی ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ مادے ختم ہو جائیں گے اور زندگی ہی زندگی موجود رہ سکے گی۔

یہ حیات مقدس انجیل کے اعتبار سے ایک لفظ ہے، جو لفظ خدا کا تھا، بلکہ خود خدا تھا۔

The word was with God—The word was God.

قرآن پاک کے اعتبار سے خدائے تبارک و تعالیٰ نے ایک لفظ کُن سے ساری مخلوقات بنائی۔ ساری کائنات کا مقصد خلق آدم کی ذات تھی کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض بن کر ساری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ بلکہ ساری کائنات کو مسخر کرلے گا شاعر نے بھی کچھ اس طرح کی بات کہی ہے:

My seed shall one day fill it and master matter to its uttermost confines, and for what may be beyond the eyesight of Lilith is too short. It is enough that there is a beyond.

اقبال نے مادہ اور روح یا حیات کی کارکردگی کو لا اور اِلّا کی اصطلاح میں بھی پیش کیا ہے ، انسان اپنے ارتقا کی آخری منزل پر اِلّا ہی سے آشنا ہوگا۔ یہ اِلّا شاید عکس لطیف ہے ضد مادہ کا Anti matter ہے

در مقام لا نیا ساید حیات
سوئے اِلّا می خرامد کائنات

شا کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ زندگی نے مادہ کو اسیر کیا ، لیکن مادہ زندگی کا مالک بن بیٹھا ، اب زندگی کی کوشش ہے کہ اس غلامی سے خلاصی پا لے ۔ اس لئے اس نے دماغ انسانی پیدا کیا ، جب زندگی عقل و دماغ کی راہ پا لیگی ، تو مادہ سے نجات پا جائے گی ۔ جیسے جیسے انسان رازدار کائنات بن رہا ہے ، مادہ کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور یہ خاکی محرم راز حق و باطل ہوا جا رہا ہے :

یہ کمزور انساں ، یہ معذور انساں
یہ مجہول انساں ، یہ مجبور انساں
کہیں سرِ ہستی کو افشا نہ کر دے

اسی خطرہ کی طرف خلقت آدم سے پہلے فرشتوں نے اشارہ کیا تھا مگر یزدانی جواب زجر پا کر خاموش ہو گئے تھے ۔ اور جب راز ہستی فاش ہو جائے گا ، تو پھر زندگی ہی زندگی ہر سمت نظر آئے گی اور مادہ سمٹتے سمٹتے روپوش ہو کر فنا ہو جائے گا۔

لطافت کثافت سے دامن چھڑائے
کبھی آئینہ پر نہ پھر زنگ آئے

لطافت سے روشن زمیں آسماں ہو
لطافت لطافت، مکاں لامکاں ہو

اس مادی دنیا سے پرے ایک اور عالم آباد ہے۔ جس میں وہی سب مخلوقات ہیں، جو یہاں ہیں مگر ان میں لطافت ہے، کثافت نہیں۔ اس انکشاف کی طرف رفتہ رفتہ سائنسداں آ رہے ہیں۔ ہمارے شعراء نے اس خیال کو شعر میں برابر بیان کیا ہے: راسخ کہتے ہیں ؎

جو عاقل ہیں سو اس جا ہیں دوانے — بشر کیا جانے اس کو تو ہی جانے
کہ تیرے علم میں پنہاں ہے کیا کیا — ورائے عالم امکاں ہیں کیا کیا
رکھوں ہوں ایسی بینائی کہاں میں — نہ لے اہل نظر یہ دیکھتے ہیں
کہ ہر ذرہ کے اندر یک جہاں ہے — مہ و مہر و زمین و آسماں ہے

(یرنگ محبت)

اب جنت، جہنم، حشر و نشر، جزا کی باتیں کچھ کچھ لوگوں کی سمجھ میں آ رہی ہیں اور وہ کب تک ان سے انکار کرتے رہیں گے" فبای الاء ربکما تکذبان۔

نظم مذکورہ صدر کی ابتداء تضاد و تخالف کے اظہار سے ہوتی ہے اور انتہا اس تباین اور کثرت کی وحدت و محبت پر ہوتی ہے۔ راسخ نے بھی اپنی مثنوی نورالانظار میں تباین و تخالف کائنات پر روشنی ڈالی ہے۔

اس جہاں کی تو بچشم بینا — ہے تضاد اور تخالف پہ بنا
عجب اک عالم اضداد ہے یہ — عیش آباد و غم آباد ہے یہ
ظرفہ ہے شخص بشر کی ترکیب — چار ضد ایک ہوئی ہے عجیب

کلیم صاحب نے اس حصہ ابتدائیہ میں شاعری بھی کی ہے اور غور و فکر سے

بھی کام لیا ہے۔ اسی متن کی تشریح کرتے ہوئے وہ جدت پیدا کرتے ہیں اور شاعری کا کمال دکھاتے ہیں:

علم سے ابھرتی ہے یہ نبضِ ہستی
اجل سے نکھرتی ہے کیا زندگانی

محبت پہ کہتے ہیں اس کی بنا ہے
محبت، مسبّب، محبت سبب ہے
محبت میں اضداد دیکھو کہاں ہے
تخالف کہاں ہے، تناقض کہاں ہے

اور جدّت و شاعری کا مکمل امتزاج ملاحظہ ہو: ؎

محبت میں کثرت سے بنتی ہے وحدت
نقوش تباین میں ملتی ہے وحدت

راسخ کا بیان پڑھیے: ؎

نکہ دانا جو ہوا اس میں ساعی — جمگی کا رگہ ابداعی
پاوے ہرگز نہ تباین سے تعی — اس تخالف کی تو ہے وجہ یہی
کہ عیاں ضد سے ہے قدر اشیا — خلق ہے اس لئے زشت و زیبا

دونوں ہی نے اس کائنات سے بالا، دوسری دنیا کے بھی تضاد کو پیش کیا ہے اور یہاں پہ چونکہ راسخ پر صوفیت یا ایزدی حشیت کا گہرا اثر تھا۔ اس لئے راسخ نے اس بیان کو ذرا طول دے دیا ہے ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
کلیم صاحب، فلسفہ اور سائنس کی دریافت کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اور

راسخ کے اجمال کی تفصیل پیش کرنے میں خلوص سے کام لیا ہے۔ زمین پر اسی تضاد و تخالف کا جال تو دیکھ لیا، اب ورائے زمین کا حال سنئے:

بہ عرش معلّٰی وہ تخت اثریٰ ہے
ادھر جبریل اور شیطاں ادھر ہے
ادھر اہرمن ہے، تو یزداں ادھر ہے
یہ اسمائے حسنیٰ ہیں کیسے نرالے
وہ قہّار بھی ہے، وہ رحمٰن بھی ہے
وہ جبّار بھی ہے، وہ منّان بھی ہے
وہ نافع بھی ہے اور وہی ضار بھی ہے

اب 'نورالانظار' کے یہ اشعار پڑھئے:

ہیں سراسر صفحات افلاک — کب نقوش متناقض سے پاک
باوجودیکہ وہ ہیگا یکتا — دیکھ سوئے متضادہ اسما
اسم ہیں اس کے تو ضار و نافع — قابض و باسط و خافض و رافع
گرچہ ہر شی سے منزہ ہے وہ ذات — پر ہیں فہیر فی اسمائے صفات

اس مثنوی کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے راسخ نے جامی کی مثنوی 'سبحۃ الابرار' کا حوالہ دیا ہے، لیکن سبحۃ الابرار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابواب کی تقسیم میں کچھ مماثلت دونوں مثنویوں میں ہے، ورنہ فنا بقا حیات و موت اور زندگی کے تضاد و تباین کا اس میں ذکر نہیں۔

کلیم صاحب نے تخالف و تعاند کو بیان کرکے، زندگی کا ارتقا اور حیات کا فلسفیانہ بیان بھی کیا ہے۔ اس تضاد کے باوجود اشیاء باقی ہیں اور آپس میں

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

ٹکرا نہیں جاتیں۔ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ کوئی طاقت ان کو اپنے تابع کئے ہوئے ہے، وہ طاقت ایک ہی ہے لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا (اگر زمین و آسمان میں ایک معبود کے سوا اور بھی معبود ہوتے، تو ان دونوں میں فساد ہی فساد ہوتا) سائنس داں اس کو اس طرح کہتے ہیں کہ وہ ضد مادہ Anti matter جو عدم کی صورت پر ہے۔ مگر وہی اصل ہستی ہے۔ اس نے مادہ کو رازِ وجود سے آشنا کیا۔ خلاؤں پر اپنا تسلط جمایا، چاند، سورج، تارے بنائے، زندگی کی موجوں میں طوفان پیدا کیا، وجود کے زیور سے ساری فضا منور ہو گئی۔ اپنی ان کامیاب اور لاتعداد تحقیقات کو دیکھ کر اسے ذرا کبر سا آگیا اور اس نے انسان پیدا کیا۔ یہاں پر آپ یاد کیجئے قرآن پاک کا وہ بیان کہ جب آدمؑ کو بنانا چاہا، تو فرشتوں نے بڑی مخالفت کی تھی۔ مگر وجود ایزدی نے کسی کی نہ سنی اور آدمؑ کو پیدا کیا۔ آدمؑ کی عظمت راسخ بھی بیان کرتے ہیں: ؎

عجز کی شان ہے کس درجہ بلند　　عجز کس مرتبہ ہے اس کو پسند
خاک ناچیز کو رتبہ یہ دیا　　کہ خلافت سے سرفراز کیا

اسی عظمت کو کلیم صاحب نے وضاحت کے ساتھ شعری حسن عطا کر دیا ہے۔ جس سے بیان میں زور، اور تجربہ میں جوش و خلوص کا پتہ چلتا ہے، آخر ام زندگی محض بھی فریب خوردۂ آدمؑ ہو گئی اور آدمؑ سے ڈرنے لگی:

یہ ڈر ہے، یہ آٹھوں پہر کا ہے دھڑکا
یہ کمزور انساں، یہ مجبور انساں
کہیں سرِ ہستی کو افشا نہ کر دے

ہو چکا ہے، وہ کیوں اس خدا کی بات کرے۔ جو طاقت جسم ضعیف میں ہے، جو جرأت فکر نحیف میں ہے، جس نے حسن عمل اور عشق جاں باز پیدا کئے۔ یہ جلوس خراماں خراماں چلا جا رہا ہے، جو دیکھتا ہے حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ انسان کا واہمہ طرح طرح کے خیالات لا رہا ہے اور اپنے خدا کو مختلف شکلوں میں بدل رہا ہے کبھی حاکم و فاتح کی صورت ہے، کبھی ظالم و جابر کی، کبھی سلطان کی شکل، کبھی شیطان کی شکل، غرض ہر وسیلہ کو انسان نے خدا بنایا۔ لیکن وہ خدا رحمٰن و رحیم ہے، وہ خالق ہے، وہ کریم ہے :

وہ موجد ہفت آسماں ہے
وہ خالق عرش و لامکاں ہے
آج اس کا جنازہ اٹھ رہا ہے
یہ لاش ہے بے کفن اسی کی

یہ جنازہ پہاڑ کی سمت جا رہا ہے۔ وہ جلوس اسی سمت رواں ہے۔ اسی کی بلندی پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش کر دیا جائے گا۔ اب یہاں آ کر شاعر اپنے خیال کو اور بھی جولانی عطا کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ انسان ہی نے اپنی فہم سے اپنی ضرورت کے لحاظ سے اپنا معبود چن لیا اور جس کو معبود بنایا گیا، وہ درحقیقت خود ہی انسان تھا۔ اس لئے کون صید تھا اور کون صیاد، اس میں فرق کرنا مشکل ہو گیا اور اسکی درماندگی کے پیش نظر، بہت سارے اوصاف اس معبود کو منتقل کر دیئے گئے :

جبار اسے بنایا تم نے
قہار اسے بنایا تم نے

اور اس اسم اعظم کے زور نفسوں سے
یہ سورج کو نوچے تو تاروں کو توڑے
یہ پھیلی ہوئی کہکشاں کو مٹا دے
ہیولا بنائے، ہیولا بنا دے

وہ آدم سرمستی کیونکر فاش کرے گا۔ شاعر اس باب میں خاموش ہے، وہ نائب خدا بن کر سورج کو نوچ سکتا ہے۔ تاروں کو توڑ سکتا ہے، یعنی ممکن ہے کہ جو قوت و صلاحیت قدرت نے انسان میں مضمر رکھی ہے۔ ان سے وہ تخریبی کام لے، یہاں پر تعمیری کام کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان بالطبع کیسا سرکش ہے اور شر کی طرف اس کا رجحان کس قدر تیز ہو سکتا ہے اب قرآن پاک کی یہ آیت پڑھیے: اِنَّا لَا نَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا وَ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ (ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کے خدا نے ان انسانوں کی تخلیق سے شر ہی کی اشاعت مراد لی ہے، یا خیر کی، بیشک ہم میں سے بعض صالح ہیں اور بعض غیر صالح۔

---

(۲۲)

وہ نوس قزح ہے، نہ وہ میثاق ازل ہے
وہ شعلہ سر طور جو چمکا تھا کہاں ہے
اب نظروں میں ظلمت کی کرن کھیل رہی ہے
سب لٹ گئیں رنگیں سی، معطر سی بہاریں

اس چھوٹی سی نظم کا یہی ہے مرکزی خیال اور یہی ہے نقطۂ عروج۔ شاعر کبھی کبھی اپنے گرد و پیش سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ ماضی کا عہد زریں اس کی نظروں کے سامنے

رقص کرنے لگتا ہے۔ انسان آج کل کس طرح پامال ہو رہا ہے، پامال کیا جا رہا ہے، یہ تو آئے دن ہر دیکھنے والی آنکھ کا مشاہدہ ہے، وہی انسان جو خلیفۃ اللہ فی الارض ہو کر آیا تھا، وہی انسان جس کو کائنات کا تصرف سونپ دیا گیا تھا، آج وہی انسان مجبور ہے، محروم ہے، بے دست و پا ہے۔ شاید خلافت کا خلعت فاخرہ بھی اس سے چھن گیا، وہ جو رازِ یزداں تھا، فاش ہو کر پھر روپوش ہو گیا۔ وہ کون سا انسان تھا اس کی طرف دو تلمیحوں سے اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی تلمیح میثاق ازل کی ہے۔ جبکہ عام انسانیت سے وعدہ لیا گیا تھا۔ سبھوں سے سوال ہوا الستُ بربکم (کیا میں تم سب کا رب نہیں ہوں) سب نے جواب دیا ہاں (قالوا بلیٰ) پھر جب انسان زمین پر آیا اور اپنی دنیا ساتھ لایا، تو رفتہ رفتہ دو بڑے طبقوں میں بٹ گیا، ایک طبقہ تو وہ تھا، جو اپنے وعدے پر برقرار رہا، یہ تھا۔ وہ طبقہ جس کو ایمان و عقیدہ کی دولت بے بہا ملی ہوئی تھی اور اس نے اس دولت کی حفاظت بھی کی تھی۔ دوسرا طبقہ وہ تھا، جو اپنے عقائد و اعتقادات سے پھر گیا تھا، اسی طبقہ کے لوگ ہر جگہ چھائے ہوئے تھے اور اسی طبقہ کی تعلیم کے لئے انبیاء مرسلین آتے گئے، دوسری تلمیح سے اشارہ ہے کہ شاعر انسانوں کی اس ٹولی کی یاد دل میں کر رہا ہے۔ جس کی ہدایت کے لئے حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے اور شعلۂ تجلی ربانی سر طور چمکا تھا قال انی انا ربک فاخلع نعلیک (اس شعلۂ نور نے کہا میں تمہارا رب ہوں، اب تم اپنے نعلین اُتار دو) یہی شعلۂ نور بجھ گیا ہے۔ اب ہر چہار سو ظلمت کی کرن پھیلی ہوئی ہے، اب تو گلشنِ انسانیت پر خزاں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بہار کے دن ختم ہوئے، بہار کے دن لٹ گئے۔

پہلے دو بندوں میں اسی غم کا اظہار ہے۔ اسی بسی ہوئی دنیا کے اُجڑ جانے

کا ماتم ہے، ایمان و ایقان لوگوں کا ختم ہو گیا۔ اس لئے ساری فضا سوگوار ہے، سبزوں سے سبزی غائب، گلوں سے سرخی ختم، پھول کھلا گئے۔ پتوں کی لاش دوش صبا پر اڑتی نظر آنے لگی ہے۔ ایمان و اعتقاد با ذموم کے جھونکوں سے جل کے رہ گئے۔ اب یقین کی جو تراوت تھی وہ ختم ہو گئی، صحن چمن گرمیوں سے جھلس رہے ہیں، دریا بھی خشک ہوا جا رہا ہے، حباب کو بھی برودت کی ضرورت ہے، وہ شاید سر اٹھا اٹھا کر اپنی بے تابی ظاہر کر رہے ہیں، صبح کا نور کافور ہو گیا اور شام ظلمت کا بسیرا ہو گیا۔ کیوں ایسا ہوا، اس کا جواب آگے کے مصرعوں میں ہے۔ ایمان کی کمی اور ایقان کے زوال سے آج ساری کائنات پر سوگ کی بدلیاں چھا گئی ہیں۔

اس کے بعد ایمان کے دور کی تصویر کھینچی گئی ہے، جب انسان وہم و گمان کا اسیر نہ تھا، جب وہ یقین کے سرمایہ لازوال سے خزینے جمع کر رہا تھا:

وہ دن ہیں مجھے یاد کہ سرسبز تھی دنیا
ہر چیز تر و تازہ تراوت کی لڑی تھی
نظروں میں مری آج بھی وہ گھوم رہی ہے
ساون کی گھٹا دیکھو تو کیا جھوم رہی ہے

اس عہد زریں کی یاد ذہن میں آتے ہی، شاعر کا دماغ ان سارے مناظر کو اپنی نظروں میں موجود پاتا ہے۔ چمن کا چمن، چمن در چمن ہے، ہر شاخ سجی سجائی پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہے، چشموں کے پانی پگھلی ہوئی چاندی دکھائی دے رہے ہیں۔ ہر طرف رنگینی فضا میں گھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رنگین فسانے اور رنگین زمانے نے طبیعتوں کو رنگینی پر ابھار رکھا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ دور ختم ہونے لگا، بلبل صد بہار اسیر غم نو بہار ہو گئی، باغ

سنسان ہونے لگا۔ آئینہ کائنات زنگ آلود نظر آنے لگا۔ شاعر کا شعور رخصت اور ایمان والوں کا ایمان رخت سفر باندھ کر کوچ کر رہا ہے۔ ہر طرف کثافت ہی کثافت کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ لطافت مغلوب ہوتی جا رہی ہے:

سنتے ہو سنو ہلکی سی آواز یہ کیا ہے
جو اڑتی ہوئی آئی ہے یوں دوش ہوا پر
جیسے کہ کہیں دور سمندر رہے خروشاں
موجیں ہیں کہ بے چین ہیں بیتابیٔ دل سے

بحر ایمان پر کثافت نے اتنی گرمی پھیلائی کہ ایمان و اعتقادات بخارات بن بن کر غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایمان کا سمندر دور بھاگتا جا رہا ہے۔ ہر روز یہ فصل بڑھتا ہی جا رہا ہے اور اب اس دریا کے دوبارہ متلاطم ہونے کی بہ ظاہر کوئی امید نہیں:

کیا میلوں یہ پھیلی ہوئی ہیں ریت کی لہریں
اور یہ ریت پہ بکھرے ہوئے ہیں سنگ کے زینے
موجیں ہیں بہت دور، بہت دور ہے ساحل
موجیں وہ اٹھیں، دیکھو وہ کس جوش سے اٹھیں

لیکن نہیں، امید فردا کا چراغ تو تاریکی میں روشنی دیتا ہی ہے، ورنہ انسان اپھڑ کر رہ جائے، سمندر دور بھاگ گیا تو ہے، پر اس کی موجیں بار دگر لرزاں ہیں۔ خروشاں ہیں۔ ایک زمانہ تھا جبکہ آدمی اپنے یقین و عقیدہ کی بدولت سربلند تھا۔ پھر ایک دن یہ بھی آیا کہ وہ نکبت آشنا ہو گیا۔ لیکن غیرت حق کو حرکت جو ہوئی، تو پھر موجوں میں تلاطم آیا۔ بادل کی طرح گرجتی، چیختی، للکارتی موجیں غضبناک لہروں کے ساتھ آئیں اور ساحل سے ٹکرا گئیں۔ یہ شاعر کا متخیلہ ہے، جو ہر طرح کی تصویریں پیش کر رہا ہے:

یہ بحر جو سمجھو تو یہ ہے قلزم ایماں
یہ چشمۂ حیواں ہے، یہی آب بقا ہے
دل زندہ ہے، جاں زندہ ہے، پائندہ ہے دنیا

مگر ان موجوں میں وہ سبک خرامی نہ رہی اور ان کے کس بل ختم ہو گئے۔ کیا عجب ہے کہ موجوں سے استعارہ ایمان والوں کے استیلا کا کیا گیا ہو ـــ اب عجب بے بسی چھا گئی۔ شاعر کا ذہن صاف ہو گیا۔ دماغ سے سارے نقوش ختم ہو گئے۔ اور اس کو حقیقت کا احساس ستانے لگا:

ساحل ہے بہت دور، بہت دور بہت دور
اب منزلِ مقصود کہاں کون بتائے
اب چشمۂ حیواں ہے، نہ وہ آب بقا ہے

وہ بحر ایماں سوکھ گیا، اس کے پانی ہوا بن کر اڑ گئے اور زمین جھلسا گئے۔ ایک خاک سی اڑتی ہے، جہاں سیل رواں تھا، وہ جنھیں یہ امانت سونپی گئی تھی چل بسے۔ جب امین ہی نہ رہے، تو اس امانت کائنات کا کیا حشر ہو گا۔ یہ زمین جو ارض خلافت تھی اب کس طرح آباد رہ سکیگی ـــ مگر دنیا آباد ہے۔ اب شاعر یہاں ذرا جلے دل کے چند آبلوں کو توڑنا چاہتا ہے۔ وہ طنز سے کام لے کر، شکوہ کرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہر شکوہ کی تہ میں ایک محبّت کی چنگاری ہوتی ہے۔ اور شکوہ اسی وقت تک رہتا ہے، جتبک کہ امید باقی رہتی ہے: ؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ہاں تو یہ شکوہ عام انداز کا شکوہ ہے، اقبال کے شکوہ کا ایک رنگ اڑائے ہوئے:

یہ آب تھا یا سیلِ سراب دل و جاں تھا
ابھرا ہوا، پھیلا ہوا، بڑھتا ہوا دھوکا
رنگیں سا، یہ زریں سا، چمکتا ہوا دھوکا
کیا جلوۂ نکہت تھا، مہکتا ہوا دھوکا
کیا شہپر شاہیں تھا، یہ اڑتا ہوا دھوکا

یقین و ایمان نے جو رازہائے سربستہ کھولے تھے پھر ایک ایک کرکے عقدہ لاینحل بن گئے، ہم نے جس نقطہ سے ابتدا کی، اسی پہ آکر رک گئے۔ یقین والوں کی آسودگی قلب و نظر تاراج ہوگئی۔ انسان نے اپنے وعدے کو بھلایا تو یزداں نے بھی اپنے وعدے کو بھلا دیا یاایھا الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت الخ یہ وعدہ ایزدی ہے، اس کو پورا ہونا ہے، مگر پورا ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایمان اور عمل صالح، ایمان حق اللہ کا نام ہے اور عمل صالح حق العباد سے استعارہ ــ اقبال کا تمام تر فلسفۂ حیات اور فلسفۂ احیائے قوم اسی آیت سے متاثر ہے، جب ایمان گیا، تو عمل صالح بھی ختم ہوگیا، اس لئے:

اب جاں کی خوشی ڈھونڈوں کہاں کیسے میں پاؤں
دنیا مری اب اجڑی ہوئی، اجڑی ہوئی ہے

اس نظم میں شاعر نے فطرت کے حسن کی اچھی اور کامیاب مصوری کی ہے کہیں کہیں تو واضح طور پہ سامنے ایک نقش آجاتا ہے

پتّے ہیں کہ یہ ننھی سی لاشیں ہیں ہواؤں
کیا سکڑے ہوئے جسم شکنجوں میں پڑے ہیں
یہ دستِ صبا نے جو شکنجوں سے چھڑایا

لو ان کے جنازے ہیں رواں دوش صبا پر

انیس کے ایک مرثیہ کا مشہور ٹکڑا گرمی کا سماں، شاعر کے تخیل کو مہمیز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا بند پورا کا پورا اسی طرح کے تاثرات پیش کرتا ہے بلکہ بعض الفاظ اور بعض ترکیبیں بھی انیس سے لی گئی ہیں۔ پہلا بند ذرا المناک لہجہ میں ہے، دوسرے کا بھی وہی حال ہے۔ چونکہ اس میں حال کی افسردگی اور ماحول سے مایوسی کا اظہار ہے اس میں طربیہ انداز کھپ نہیں سکتا۔

اس کے بعد جب شاعر کا تخیل ماضی کو حال بنا ہوا نظروں کے سامنے دیکھتا ہے تو اس کا لہجہ قدرے مسرت آگیں اور پُرسکون معلوم ہوتا ہے، خیال کی رنگینی ماحول کو رنگین بنا جاتی ہے، ایک سرد انگیز روانی بیان میں آجاتی ہے، پھر یہ لہجہ رفتہ رفتہ مدھم ہوتا جاتا ہے اور ماضی سے بار دگر حال کی طرف، خیال سے یکبارگی حقیقت کی طرف پلٹنے پر آواز بیٹھی بیٹھی سی ہو جاتی ہے، آخر میں ایک جھلاہٹ سی آگئی ہے اور یہ جھلاہٹ اس محرومی کا نتیجہ ہے، جو امید کثیر کے بعد پیدا ہوتی ہے، شکوہ کا انداز پر فخر ہے، بات میں بات نکل گئی اور کام کی بات زبان پر آگئی۔ جیسے جیسے تلخ حقیقت کا انکشاف ہوتا جارہا ہے لہجہ اُداس ہوا جاتا ہے اور آخر میں اداسی اور ویرانی، حرماں نصیبی اور بے دست و پائی کا احساس تندسے تند ہو جاتا ہے اور صرف زبان سے یہی آواز نکل آتی ہے

سب لُٹ گئیں، رنگیں سی، معطّر سی بہاریں

جہاں تک شاعری کے آرٹ کا تعلق ہے۔ یہ نظم فنّی مہارت کی دلیل ہے، بہ ظاہر کچھ الفاظ زیادہ معلوم ہوتے ہیں اور بیانات حشو و زوائد سے پاک نہیں رہتے۔ لیکن غور کرنے پر ایک ایک لفظ ایک الگ معنی پیش کرتا ہے،

شاعری میں استعارات اور تشبیہات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نظم میں بعض استعارے نادر اور بعض تشبیہیں شاداب و جاندار ہیں، مثلاً:

کیسی ہے حبابوں کی یہ بیتابیٔ دلسوز
اٹھ اٹھ کے وہ کہتے ہیں ذرا پانی پلا دو

گاتے ہوئے موتی ہیں، یہ قطروں کی زبانیں

شاعر نے کامیابی کے ساتھ فن اور مقصد کو باہم دگر پیوست کر دیا ہے۔ اس نے اپنے کو بہ ظاہر کسی بھی جماعت سے منسوب نہیں کیا۔ لیکن بعض ٹکڑے اس کی اس کوشش کو رائگاں کر دینے میں دیدہ دلیری کر رہے ہیں۔ مثلاً:

اللہ یہ موجوں پہ عجب وقت پڑا ہے
اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے

یہ حالی کی مناجات کی پرچھائیں ہے۔ اب قارئین خود بخود حالی کے دوسرے اشعار کی طرف متوجہ ہو جا سکتے ہیں۔ حالی اپنے اوپر عائد کردہ پابندی سے محدود ہو کر رہ گئے۔ مگر اس نظم کے شاعر نے سارے رسوم و قیود کو توڑ کر انسانیت کا مداوا کرنا چاہا ہے۔ اس نظم میں ۱۳۵ مصرعے ہیں۔

---

(۲۳) یہ استخواں جو مرے ہاتھ میں ہے، دیکھو تو
یہ کھوکھلا سا ہے جیسے شکستہ ساغر مے
وہ مے کہاں ہے جو رنگین اسے بناتی تھی
کھلے کھلے سے یہ روزن ہیں ان میں جھانکو تو

وہ میرا مغز کہاں ہے، جو مغز ہستی تھا

اس مصرعے پر اس نظم کا بنیادی تصور قائم ہے۔ یہ استخواں بھی دراصل کاسہ سری ہے۔ اسی مجموعہ ۱۶۱ کی نظم کی ابتدا بھی اسی مصرعے سے ہوتی ہے۔ "یہ استخواں جو مرے ہاتھ میں ہے دیکھو تو"، دونوں نظموں کو ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کاسئہ سر کی بے زبانی اور خاموش کہانی سے کس حد تک متاثر ہوا ہے۔ میر کے قطعہ کی خوبیوں کا اعتراف اردو شاعری یہ ایک نظم میں ملتا ہے، انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ مصنف پر بھی لاریب دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے بضاعتی کا اثر ہے۔ مگر انہوں نے کائنات کی فنا کا بیان ایک پیچیدہ انداز میں کیا ہے، پہلی نظم فنا کے احساس کے باوجود، جمود اور تعطل کی تعلیم نہیں دیتی، اس میں زیست کا انقباضی پہلو حاوی نہیں ہے۔ اور زیست کو لائق زیست بناتے رہنے کی مسلسل کوششوں کی راہ کھلی کھلی ملتی ہے۔ اس میں استخواں کے ساتھ گوشت اور پوست جو ملے ہوئے ہوتے ہیں ان کی بربادی کا ذکر ہے اور اس گوشت و پوست کے جو تقاضے ہیں انھی کا بیان ہے۔ اس سے حسن وجود میں آتا ہے اور اسی کی پیدا کردہ حدت کا نام شباب ہے اور اسی شباب کی امنگوں کا نام چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہے، اس کا تعلق ظاہر ہے۔ اسی لئے یہ نظم ذرا واضح ہے اور سادہ۔ لیکن مذکورہ صدر نظم میں ذرا پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ یہاں دماغ کی باتیں ہیں۔ یہاں فکری کاوش کا عملی دخل ہے۔ انسان جو بھی کرتا ہے، وہ دماغ ہی سے کرتا ہے۔ دماغ ہی اس کو آمادہ کرتا ہے، اس کی راہ ہموار کرتا ہے۔ پہلی والی نظم میں زندگی ہنسی خوشی کاٹنے کی تلقین ہے۔ اس نظم میں اس کی تردید نہیں،

یہاں بھی منتہائے نظر یہی ہے کہ زندگی کو قابل فخر بنایا جائے۔ لیکن دماغ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وجود کی سچ مقداری کا شعور رکھے، انسان سب کچھ، پھر کچھ بھی نہیں۔ اس کی فکر روشن نے یہ راز آئینہ کر دیا ہے کہ انسان نے اپنی قدرت کا مظاہرہ تو بہت کچھ کیا۔ دماغ نے انسان اور انسان کے درمیان موٹی موٹی حد فاصل قائم کر دی ہے۔ آدمی نے اپنے دماغ سے بہت سارے بت تراشے اور طرح طرح سے شر کی پرستش کی صورتیں نکالیں، اپنی قوت و جبروت منوانے کے لئے معصوم انسانوں کو بڑی چھوٹی اونچی نیچی، اچھی بری آزاد اور غلام کی مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا:

یہ آدمی ہے جو یوں آدمی کا دشمن ہے
یہ ملک و مال کے جھگڑے یہ ملتوں کے فساد
فساد بندۂ و آقا، یہ رنگ خوں کا فساد
فساد محنت و سرمایہ، سرخ سرخ فساد

مگر ان بلند بالا ہستیوں نے، سطوت و سلطنت کے ان مالکوں نے یہ نہ سمجھا کہ انسان، انسان ہی ہے، جو آیا ہے جانے کے لئے، جو زندہ ہے مرنے کے لئے کائنات کی ہر شئی پر اس کا اختیار ہے۔ مگر وہ خود کسی دوسرے کے اختیار میں ہے اس مختاری پر ایسی مجبوری کا احساس کسی بھی ذی شعور انسان کو اپنے اختیارات کے استعمال میں احتیاط، نظم اور ضبط پر مجبور کرتا ہے:

میں کیا ہوں اور یہ مجبور دست و پا کیا ہیں
مرا خیال، مرا دل، یہ میری جاں کیا ہے

یہ مغز استخواں ایک مکڑی کی طرح بنایا گیا ہے۔ عنکبوت خود ہی تار بنتا ہے

کیسی اسے کبریائی بخشی
کیسی اسے بے نیازی بخشی
ستّار عیوب بھی بنایا
غفّار ذنوب بھی بنایا

مگر انسان، متلوّن مزاج انسان ایک حال پر صبر کرنے والا نہ تھا۔ اس نے پھر رُخ پلٹا، جس کو اس نے رخِ روشن کا آئینہ بنایا تھا، اپنا مسجود اور معبود بنایا تھا۔ اس کے سر سے تاج چھین لیا۔

اُترا جو یہ تاج اس کے سر سے
وہ شرم سے گر پڑا زمیں پر
اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا

تاریک ہے آج ذہنِ انساں
ہیں فکر میں عقدے پیچ در پیچ

انسان نے تو اس خدا کا جنازہ ہی نکال دیا، جس نے برابر اس کی حفاظت کی، جو خود سوتا نہ تھا، مگر اسے سونے کا موقع دیتا تھا، جو خود کھاتا نہ تھا، مگر ہم سب کے لئے کھانے کا سامان مہیّا کرتا تھا، یہ سب اس لئے وہ کرتا تھا کہ دنیا میں خیر ہی خیر کا بسیرا ہو۔ مگر انسان خیرِ مسلسل سے گھبرا گیا اور انسان، خیرِ مسلسل سے گھبرا ہی جاتا ہے، آدمؑ جنّت سے اسی لئے نکالے گئے، بنی اسرائیل پر مَن وسلویٰ اسی لئے روک دیا گیا۔ قرآن پاک میں اسی طرح کے خیرِ مسلسل کا ذکر سورۂ رحمٰن میں ہے، جو انسانی آسودگی کا نشان دیتا ہے فبای الآء ربکما تکذّبٰن (پس تم اپنے رب کی کن کن

اور خود ہی اس میں اس طرح چھپ جاتا ہے۔ کہ دوسرے کو مشکل سے نظر آئے، مکڑی کے جالے کا وجود ہی کیا، مولانا عبدالحی فرنگی محل کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا گیا تھا اس کا ایک مشہور مصرع یہ ہے: "انما الدنیا وما فیھا کنسیج العنکبوت" بے شک دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے مکڑی کے جال کی طرح ہے۔ لیکن یہاں مکڑی کو انسانی افعال اور اعمال پر حکومت کرتی ہوئی بتایا گیا ہے:۔

یہ عنکبوت جو بیٹھا ہے آستواں میں مرے
اسی کے تاروں کی ہلکی لطیف لرزش سے
نئے نئے ہیں یہ رنگیں حسین نظارے
وہ دیکھو تار کھنچا، دیکھو اس نے جنبش دی

مغز دماغ آدم اپنی حیرت نشان ایجادات کا خود شکار ہو گیا۔ مکڑی نے اپنا وجود منوایا، تو مگر وہ خود تانے بانے میں مگر کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کسے مجال دکھائے کہاں وہ بیٹھا ہے
کسے یہ تاب ہے دل پر جو اس کے ہاتھ لکھے
سلجھ سلجھ کے الجھتی ہیں گتھیاں ایسی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

اسی طرح انسان ترقی کی ساری منزلیں طے کر لینے پر بھی مجبور و بے دست و پا ہی رہا، اس تنگنائے حیات میں اس نے بڑی وسعت پیدا کی آدم کو نئے نئے امکانات سے آشنا کرایا، کامیابی اور ناکامیابی کا راز بتایا، آزادی اور غلامی کا سواد عطا کیا اور ہر طرح سے مادی ترقی کی انتہا تک آ گیا۔ آزادی کے عزیز مہذب خیال کے تحت ہر طرح کی آزادی حاصل کر لی یہاں تک کہ مذہب سے بھی آزادی

حاصل کر لی، خدا سے بھی آزادی حاصل کر لی۔ ترقیوں کے شعور و ادراک سے اپنی خودی کو جلا پذیر کیا اور پھر نامنظم خودی نے اسے انکار حق کی مہلت دیدی۔ سب کچھ ہوا مگر جب غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور اس کی گرفت کا وقت آیا کہ اِنّ بطشَ ربّکَ لشدید (لاریب تمہارے رب کی گرفت سخت ہے) تب وہی معزور اور مجبور انسان وہی معزول اٹھا: "یہ اختیار پہ دیکھو تو جبر کیسا ہے"

مختاری اور مجبوری انسان کی سرشت کا تقاضہ ہے اور ہر فکر انگیز شاعر نے اپنے اپنے طور پر اس مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ میر نے فطرت کے اس تقاضہ کو اپنا تجربہ بنا کر پیش کیا ہے، اسی لئے وہ زندگی کے ایک رخ کے ایک الگ ملکہ ہلکے رنگ کو سامنے لاتا ہے۔ یہاں شاعر نے بہت سارے تجرباتِ انسانی پیش کئے ہیں انسانی حیات کے ارتقائی ادوار سے لے کر تمدن و تہذیب کی انتہائی منزل تک کے تخیلی تجربات بیان ہوئے ہیں۔ انسان ابتدائی زمانہ میں کس طرح ایک سہارا کی تلاش میں ایک پناہ کی جستجو میں سرگرداں رہا، مظاہر قدرت کے آگے جھکا، شجر، حجر، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، آگ، پانی، سب کو معبود بناتا رہا، مندروں میں اور مسجدوں میں اپنی نیازمندیوں کا اظہار کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اپنی نیازمندیوں کو وہ اپنی فطرت کی توہین سمجھ بیٹھا، اس کی خودی بیدار ہوئی اور اس نے اپنے بنائے ہوئے سہارا کو ختم کر دیا، اپنی پناہ کو حجاب اندر حجاب کر دیا، وہ ہر بندھن سے آزاد ہو گیا۔ پھر تجربات کا چکر چلتا رہا اور ان کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پھر وہم و گمان کا شکار ہو گیا۔ یقین و اعتقاد کا آئینہ ٹوٹ گیا اور اسے اپنی مجبوریوں کا احساس ستانے لگا ـــــ یہ احساس اتنے وسیع اور پھیلے ہوئے تجربات کی بدولت حاصل ہوتا ہے کہ قارئین کے ذہن میں انسان کی مختاری و مجبوری

کا فرق مبرہن اور غیر مبہم ہو کر، جاگ اٹھتا ہے ۔ ۱۷۸ مصرعوں کی یہ نظم انسان کی رفعت خیال کو ہشت پہل بنا کر سامنے لاتی ہے، اس میں فلسفہ کی گہرائی بھی ہے اور فلسفہ کا الجھاؤ بھی ۔۔ مگر خیال اور فن نے فلسفہ کو ہر موڑ پر دبا دیا ہے۔ اسی لئے مقصدی ہوتے ہوئے بھی یہ نظم نظم ہے۔ اس میں بھی سرخ سرخ فساد کا ذکر ہے، انسانیت کی کراہ کا ذکر ہے۔ تمیز بندہ و آقا کا ذکر ہے، ____________ مگر یہ ذکر حیات کے ارتقائی دور کے ذکر میں بات میں بات کے طور پر آ گیا اور اسی لئے ذوق سلیم پر گراں بار نہیں ہوتا، یہ اشتراکی نظریہ کی تائید میں نہیں ہے۔ بلکہ اشتراکی نظریہ کے اس پہلو کی ناگزیری کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں نظریہ اور اعتقاد مل نہیں پاتے۔ یہاں فساد کا ذکر مقصود بالذات نہیں۔ اسی لئے ہر طرح کی جراحت سے یہ بچ گئی ہے۔

---

(۲۴) ۴۲ مصرعوں کی یہ نظم رومان اور حسرت کی ملی جلی تصویر ہے، عشق و محبت کو مادی سطح پر دیکھنے والا انسان بھی محبت کے لازوال خزانے سے بہرہ یاب ہوتا ہے، عشق کی ناکامی اسے برابر کے لئے ناکام کر دے سکتی ہے "عشق نے غالب نکما کر دیا" اور اسی عشق کی کامیابی اس کی زندگی کو سدا بہار بھی بنا سکتی ہے ۔ یہ تو عاشقوں کا اپنا اپنا مقسوم ہے۔ اس نظم میں عشق ناکام کے کرشمے دکھائے گئے ہیں ڈرامیٹک مونولوگ کی یہ شکل دیدہ زیب ہے، ناکامیوں سے کام لینے والا عاشق مجبور اپنی مجبوری پر صابر و شاکر زندگی کے دن کاٹ رہا ہے اور اپنی مجبوری کو وہ سرمایۂ حیات بنائے بیٹھا ہے، اس کو اپنی مایوسیوں نے مایوس بھی کیا اور احساس حقیقت بھی عطا کی۔ اس نے اب اپنی تنہائیوں سے مکمل مفاہمت کر لی ہے ۔ اس کو کسی حال میں بھی چھوڑ دے

کو تیار نہیں کہ یہی تنہائیاں اس کا مقصد زیست ہیں، شاید غالب کے اس شعر نے اس نظم کی تحریک کی ہو:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بوریا ہے کہ یہ ہے نقش حصیر
میرے سونے سے مکاں میں اب تو
ساز و سامان نہیں ہے کچھ بھی

مجبوری اور ناداری کا اظہار کئی مصرعوں میں ہوا ہے۔ مگر یہاں اوّل مصرع سے جو بات نکلتی ہے، وہ غالب کے احساس ناداری سے بھی زیادہ تیکھا احساس پیدا کرتی ہے، بوریا یہاں ہے تو وہ بھی خستہ اور چٹائی کا نقش معلوم ہوتا ہے، چٹائی بھی نہیں ایک خستہ و شکستہ بوریا ہے، جو دراصل نقش حصیر ہے، لیکن اس کے بعد والے مصرعوں میں اپنی ناداری کا جو اظہار کیا گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ وہ انسان ایک متمول ماحول کا عادی تھا اور متمول ماحول میں بوریا کا ہونا روایتی عسرت و افلاس کا نشان معلوم ہوتا ہے۔ صرف عسرت و افلاس ہی راہ میں رکاوٹ نہیں، بلکہ اس کی محرومیوں نے اس کی زندگی کو اس نہج پر ڈال دیا ہے جس سے اس کو محبت ہو گئی ہے۔ پہلے دو بندوں میں اسی حرماں نصیبی کا بیان ہے کہ محبوب نے بلایا تو ہے۔ مگر وہ اس دعوت کی پذیرائی کے لئے نہ تو اب اہل رہا اور نہ اب تیاری ہو سکتا ہے۔ اب اس کے گرد و پیش میں وہ لطافت نہ رہی، جو اسے ان لطافتوں سے لذت اندوز رکھ سکے، اب اس کا باغ سنسان ہے، اداس ہے، جو پھول ہے بے رنگ ہیں۔ سبزوں سے سبزی چھن گئی۔ غنچوں کی چٹک کسی نے غصب کر لیا۔

کوئل آتی ہے پہ کو کو ہی نہیں
دیکھو بلبل کی زباں بھی ہے خموش

اب اس کا دل ایک ٹھنڈا مضغہ گوشت کے سوا کچھ بھی نہیں، نہ تو اس میں اب آرزوؤں کی گرمی ہے، نہ شوق کی لپک، نہ کوئی تلاش کا جذبہ اور نہ حوصلوں کی گنجائش۔ یہاں تک کہ اب تو حسرت اور حیرت جدائی کی بھی جگہ نہیں کہ یہ حسرتیں بھی تو شوق اور امید ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر اس کا دل کسی طرح دل کہلانے کے لائق ہی نہیں۔ تو اس دل میں تمنائیں کس طرح مچل سکتی ہیں:

دل دھڑکتا ہے یہ دھڑکن کیا ہے
اس میں کچھ درد نہیں، سوز نہیں

ابتدائی تین حصّوں میں بے بسی، ناداری اور نااہلی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک وقفہ آتا ہے، جس میں اس کے محبوب کا ردعمل سامنے آتا ہے:

تم نہ آئے پہ نہ آئے دل میں
میرے پھولوں کو تو سونگھا ہی نہیں
میرے ہاروں کو تو پہنا ہی نہیں

اس کے انتظار میں اس کی محبوبہ نے جو بناؤ سنگار کیے سب رائگاں ہوئے وہ پھولوں سے لدی پھدی تھی۔ وہ نغموں میں رچی بسی ہوئی تھی مگر مایوس ہو گئی۔ پھولوں کی نکہت پیغامبر بن کر آئی۔ شادابی کا سندیسا

لے کر آئی، وصل کا مژدہ بن کر آئی اور اسے طرح طرح سے چھیڑتی رہی اس کے جذبوں کو گدگداتی رہی:

ایک دن بھی تو ذرا آجاؤ
میری آنکھوں میں بسو دل کو بساؤ

مگر نکہتِ گل لوٹ کر نہ گئی ع 'وہاں جو گیا، ہو رہا وہ وہیں کا' گویا اس نکہت انائے محبوب میں اتنی غیرت تھی کہ تنہا لوٹ کر جانا اس نے پسند نہ کیا:

تم نہ آئے نہ وہ نغمے لوٹے
ایسے کھوئے کہ وہ پائے نہ گئے

اس مصرع کے زبان پر آتے ہی وہ چونک اٹھتا ہے، خود جو کھویا ہوا تھا پھر اپنی پوزیشن پر واپس آگیا، اور پھر وہی دعوت یاد آجاتی ہے کہ محبوبہ نے بلایا تو ضرور ہے، مگر جائے بھی تو خالی ہاتھ گیا جائے، انسان کسی کے یہاں خالی ہاتھ تو جاتا نہیں۔ پھر وہ اپنا ہمراز ہے، وہ تو بے حسی اور بے بسی کا ایک پتلا بن کے رہ گیا ہے، نہ اس کی رگوں میں خون دوڑتا ہے، نہ خون، خون ہی رہا ہے، اس کا دل مردہ، اس کی آنکھ بے نور، بس زندہ ہے، سانس آتی ہے، چلی آتی ہے۔ چونکہ زندگی کا نام چل رہا ہے، نہ تو خوشی ظاہر کرنے کے لئے کوئی شئی ہے۔ نہ اس کے پاس اپنے غموں کو دکھانے کے لئے کوئی آئینہ، اب تو آنکھ کے آنسو بھی خشک ہو گئے:

دیکھو نظموں کے شکستہ ہیں رباب
کب سے ہیں تشنۂ مضراب یہ ساز

اب اس کا انا بیدار ہوتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ اس کے چاہنے والے اور بھی تو ہیں، جو اس کے پاس جاتے ہیں اور نذر لاتے ہیں، آج انھی میں سے کوئی جائے گا اور غرور جائے گا، تاروں سے کاٹ کے ان کی لویں لے کر جائے گا، چاند سے اس کی چمک چھین کر ساتھ لے جائے گا، کہکشاں کی رو پہلی شاخوں کو توڑ کر لے جائے گا — مگر ہم نادار، نادار کیا لے جا سکتا ہے۔

اب نظم آخری پہلو پر پہنچ جاتی ہے، — اب وہ محبوبہ سامنے ہے اور اسی سے براہ راست سوال کئے جا رہے ہیں:

تم نے کیوں آج بلایا ہے مجھے
اپنی تنہائی سے کیسے بچھڑوں
دل ہے مایوس یہ جاں ہے مایوس

اس نے ہر طرح اپنی مجبوریوں کا اظہار کر دیا، اب بتاؤ تو بلاتی کیوں ہو۔ مجھے شرمندہ یہ کیوں کرتی ہو۔ ہاں تمھاری پرانی التفات اگر باقی ہے، تو تم ہی آجاؤ، میں تو اب اپنی تنہائیوں کا سہارا چھوڑ کر، اس جگہ سے ٹلنے والا نہیں۔

تم جو آجاؤ تو دل جاگ اٹھے
میری کھوئی ہوئی دولت مل جائے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی راکھ ابھی ہر طرح سے ٹھنڈی نہ ہو پائی ہے۔ محبوبہ کی ایک دعوت نے پھر اس کے قدم ڈگمگا دیئے اور اگلی توانائی حاصل کرنے کی ایک مدھم سی آرزو جاگ جاتی ہے:

بھولے بسرے وہ عزائم اُبھریں
ولولوں کے مرے طوفاں لپکیں

گلشنِ جاں میں بہار آجائے
میرے شعروں پہ نکھار آجائے

نفسیاتی طور پر یہ صورت فطرت کے قریب ہی نظر آتی ہے۔ پھر بھی وہ آدمی ہے ایک راکھ کا ڈھیر تو نہیں، وہ گوشت و پوست رکھتا ہے۔ کاغذی چہرے اور ہڈیاں تو نہیں جن میں کسی طرح کی حرارت رہتی ہی نہیں:

آخری بند کے یہ دو مصرعے غور طلب ہیں:

بینوا ہوں میں شہ حسن ہو تم
تم تو رحمٰن بھی ذوالفضل بھی ہو

یہ دو صفتیں اس نظم کا رخ موڑ رہی ہیں، اور یہ نظم سراسر ناسوتی دنیا کی نہیں ہو جاتی، بلکہ عالم بالا کی طرف بھی رہبری کرتی ہے، سراسر جسمانی اور جنسی نہ ہو کر روحانی اور اخلاقی بھی ہو جاتی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ نظم بھی شکوہ کی ایک مدھم لے ہے اور خود کو سزاوار نعمت بے پایاں بنانے کی ایک پکار،

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال کہ ہے طریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

---

(۲۵) ریگ ساحل پر نیساں کیسے بنے
درد دل درماں جاں کیسے بنے

ان دو مصرعوں نے علی سردار جعفری کی نظم آخری خط کو ایک زندگی بخشدی ورنہ

اس نظم میں کوئی ایسا عنصر نہیں، جو زمانہ کی نرمی اور گرمی کو برداشت کرتے ہوئے زندہ رہے، یہ وقتی جذبہ ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ ختم ہوتا جائے گا۔ ریگ اور پرنیاں کی اصطلاح دراصل اقبال ہی کی ہے، معنوی لحاظ سے دیکھا جائے پھر بھی یہ نظم اقبال ہی کی آواز کی گونج ہے۔ جعفری صاحب زمین کو آسمان بنانا چاہتے ہیں اور ریگ کو پرنیاں۔ ریگ تو پرنیاں بن کر آرام کا سبب بن سکتی ہے، مگر زمین آسمان بن کر شاید دکھ ہی دیتی رہے گی، یہ استعارہ لفظی رعایت کا شکار ہو گیا ہے۔ مقصود اس خط کا یہ ہے کہ جب سارا عالم اشتراکی بن جائے گا، جب ساری زمین اشتراکی بن جائے گی اور جب آسمان بھی اشتراکی بن جائیگے، تب ہی نجات حاصل ہوگی، انسانیت کے سارے دکھ درد کا علاج سرخ تہذیب، سرخ مذہب اور سرخ حکومت سے حاصل ہو سکتا ہے، لال لال لہو میں نہانے سے اور نہاتے رہنے سے آدمیت کے سارے معائب خود بخود دھل جائیں گے۔

جعفری صاحب بغاوت، انقلاب اور خونی انقلاب سے اس درجہ متاثر ہیں کہ ان کے لہجہ میں غیظ و غضب رچا بسا ہوا ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ صرف انقلاب، بغاوت یا مقتول ہو جانے سے قسمت نہیں بدلتی، جب تک کہ قسمت بدلنے کے اسباب وجود میں نہیں آتے۔ انقلاب کے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ خود انقلاب لانے والا بھی اپنے اندر تبدیلی لائے۔ آئے دن کا تجربہ ہے کہ صرف انقلاب سے حالات سازگار نہیں ہو سکے، انقلاب لانے والوں اور انقلاب کے شکاروں کی ذہنیت بدلنی ہوگی۔ انسان کسی ایک خطہ میں محبوس نہیں اور ہر خطہ کے انسان کا اپنا اپنا تقاضہ ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے پر ہی ایک انسان دوسرے خطہ کے انسان سے رابطہ قائم کر سکتا ہے اور عالمگیر

انسانی برادری قائم ہو سکتی ہے، اقبال نے اسی عالمگیر انسانی برادری کو حاصل کرنے کے لئے اپنی آواز اٹھائی اور صحیح طور پر یہ تجویز پیش کی کہ سب کو ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو جانا چاہیئے۔ جو نہ کسی ملک سے متعلق ہو، نہ کسی خاص سرزمین سے وابستہ، نہ کسی نسل کے ساتھ مختص ہو۔ ایسا وسیع رشتہ اور ایسی کشادہ ذہنیت ان کو مذہب کی پیروی سے ملتی ہے۔ اس لئے کہ مذہب ہی وہ ضابطۂ اخلاق ہے، جو امن اور جنگ کے لئے اصول و ضوابط متعین کر سکا ہے۔ نہ تو ہر وقت امن سے کام چل سکتا ہے اور نہ ہر وقت جنگ سے۔ لیکن جنگوں کا مقصد بھی امن لانا ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ جنگ کبھی حد سے متجاوز ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ حد سے تجاوز کی تعیین عام طور پر جنگ کے حامیان نہیں کر سکتے اس لئے اس جنگ کا ذکر ہی فضول ہے۔ اب ہمیں امن کی راہ سے جنگ کو بند کرنا ہوگا۔

کلیم صاحب نے ۱۳۹ مصرعوں کی اس مختصر نظم میں اسی انسانیت کی کراہ اور اس کے علاج کی طرف التفات کی ہے۔ مگر احساس منصب ان کو کھل کر سامنے آنے سے روکتا ہے لہٰذا اپنی شخصیت کو بالکل الگ کر کے ایک آواز کے ذریعہ وہ کہنے کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ یہ آواز ان کا الہام (Intuition) ہے یا یہ آواز ان کے خیالات کی صدائے بازگشت ہے، یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حیات کیا ہے، اور زندگی کیا چاہتی ہے، انسان اپنے اندر پوشیدہ امکانات کو فراموش کر بیٹھا ہے، اس نے اپنے کو طرح طرح سے محدود کر دیا ہے، وہ اسیر شام ہے، پابند سحر ہے، جو طرح طرح کے جال میں پھنسا ہوا ہے، جال میں پھنسا ہوا پرندہ مجبور ہے۔ انسان بھی مجبور ہے، انھی مجبوریوں نے اسے تنگ ذہن بنا دیا ہے اور جب تک یہ تنگ ذہنی رہے گی، وہ اپنے بنائے ہوئے جال کے

نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)۔

سوتا نہیں اونگھتا نہیں وہ
وہ جاگتا دیکھتا رہے گا

خدا کی یہ صفت قرآن کی بتائی ہوئی ہے، لَا تَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ
اس نظم کے آخری تین ٹکرے ہارڈی کی نظم کے چار ٹکروں کی (۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶)، کی پرچھائیاں ہیں۔

دیکھو تو یہ کون کہہ رہا ہے
یہ سب ہے غلط، فریب ہے یہ
طوفان اٹھایا ہے کسی نے
بہتان لگایا ہے کسی نے
یہ سانگ بنایا ہے کسی نے
زندہ پائندہ وہ رہے گا (ھُوَالحی القیّوم)

اب پڑھیئے ہارڈی کی نظم کے یہ مصرعے:

Some in the back ground then I saw
Sweet women, youths, men, all incredu lous
Who chimed "This is a counterfeit of straw
This requiem mockery! still he lives to us"

انسان کو اس کی ضرورت برابر رہی ہے اور برابر رہے گی، جو اس پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ اس مضحکہ خیز خبر کو غلط اور بہتان عظیم سمجھتے ہیں۔ آخری ٹکروں میں شاعر عروج اور اختتام دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے:

حلقوں کو کستا ہی جائے گا اور انسانیت بہر حال مقید ہی ہوتی رہے گی ۔ اور وہ حقیقی زندگی کی مسرتوں سے دور ہی ہوتا جائے گا:

توڑ زنجیروں کو زنداں سے نکل
وقت ہے آزاد زندانی نہ بن
اپنی امیدوں کا دامن چھوڑ دے
اپنے ارمانوں کا شیشہ توڑ دے

یہ امید اور یہ ارمان بھی وقت اور زمین کی پیداوار ہیں اس لئے مقامیت کے ہر نشان کو مٹا دینے پر ہی آفاقیت حاصل ہو سکیگی، یہ پوری نظم اقبال کے پیغام انسانیت کا معنوی چربہ ہے۔

ان کی نظم "ایک آواز" بھی کچھ اسی طرح سے چلتی ہے، مگر وہاں ایک فرد واحد کا ردعمل ہے اور اس نظم میں اس آواز نے خود راستہ کی ساری دشواریوں کا ذکر کر کے ان سے بچ نکلنے کی تدبیر بتائی ہے، یہ آواز بے آواز ملہم غیبی بن کر سارے پردے اٹھاتی جا رہی ہے۔ آخری ٹکڑے کے بعض الفاظ سے اشارہ ہو رہا ہے کہ اقبال کی اصطلاح کرگس اور شاہیں سے شاعر مطمئن نہیں۔ اس کے خیال میں کرگس اور شاہیں بھی فضائے بسیط کے زندانی ہیں۔

چشم شاہیں کور ہے، بے نور ہے
فکر شاہیں، خام ہے معذور ہے

وہ آواز فکر روشن کو دعوت دیتی ہے کہ سارے لواحق سے رشتہ منقطع کر کے انسان کو اپنے فکر و تدبر کی مدد سے قید زماں اور قید مکاں سے نجات پانا ہے:

کیسی ہے یہ قید زماں، قید مکاں
یہ مکاں تیرا ہے، تیرا لامکاں
فکر کو روشن بنا روشن بنا
درد کو درماں بنا درماں بنا

انداز تخاطب تو اقبال ہی سے لیا ہو لیے، مگر یہاں حیات کے فکری پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کہ اعمال اگر فکر و تدبّر کی بھٹی سے تپ کر نہیں نکلتے، تو اپنی جاذبیت برقرار نہیں رکھ سکتے، بلکہ ایسے اعمال وحشت و بربریت تک لے جا سکتے ہیں اور لے جا رہے ہیں۔

اقبال نے اعمال صالحہ کی مدد سے، مردِ کامل کی تشکیل کی، کلیم صاحب نے فکر روشن سے "مردِ مختار" کی تشکیل کرنا چاہا ہے۔ خودی اور بے خودی کے راز سے یہ بھی آشنا ہیں اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کی ضرورت یہ بھی محسوس کرتے ہیں۔ مگر انداز تو دیکھو،

خواب غفلت روز بیداری ہے
بے خودی سے ذوق ہشیاری ہے
تیری مجبوری سے مختاری بنے
ریگ ساحل پر نیساں بن کر رہے
درد دل درمان جاں بن کر رہے

اقبال سے پہلے ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا، جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے مقتضیات کا عمیق مطالعہ کیا ہو، ہاں نظیر اکبر آبادی نے اس کی طرف توجہ کی اور انسانیت نواز مسائل پر روشنی ڈالی، بلاشبہ وہ عظیم شاعر تھا اس لئے

کہ اس نے ایک عظیم تصورِ حیات و کائنات پیش کیا تھا، یہ تصور کسی بھی مذہب کے ماننے والے کے یہاں مل سکتا ہے، کسی خاص جماعت یا مذہب کی قید نہیں بس ایک شرط ہے۔

چھوڑ یہ اندیشۂ سود و زیاں
وہم کے پھیلے ہوئے کہرے کو چھوڑ
برہمن کو چھوڑ واعظ کو بھی چھوڑ
اور اصنامِ خیالی کو بھی توڑ

الغرض اس طرح کے جتنے جال انسان کی فریب کار عقل نے بچھا رکھے ہیں، ان سب کو توڑ کر ہی انسان انسانیت کی راہ پر چل سکتا ہے، یہاں کی رہنے والی دو بڑی قوموں نے اپنے اپنے خصائص کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ وہ اوہام باطلہ کے شکار ہو گئے ہیں۔

اس نظم کے پہلے حصہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح وہ آواز، لامعلوم آواز، آوازِ بے آواز، فضائے بسیط میں شہنائیاں بن کر گھل گئی ہے اور ساری کائنات اسی نغمہ سے تھرتھرا رہی ہے، دوسرے حصہ میں وہی آواز کچھ کچھ صاف ہونے لگی، کائنات کو ضرورت ایک ایسے انسان کی ہے۔ ایک ایسے خلیفۂ خدا کی ہے، جو اس پر بار دگر حکمرانی کرے، جو اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ اس لئے وہ آواز پکارتی ہے، للکارتی ہے:-

اے اسیرِ شام، پابندِ سحر
اے اسیرِ حسن، پابندِ جمال
اے اسیرِ شوق پابندِ ہوس

اے اسیرِ دامِ گلچینِ عظیم
اپنے ارمانوں میں کیوں اُلجھا ہے تو

اے انسان تُو نے طرح طرح سے امیدوں کے تانے بنے اور خود اس میں قید ہو گیا، اگر تو آزادی چاہتا ہے، تو خود کو آزاد ہونے کی تمنا سے آزاد کرلے، اپنی امیدوں اور آرزوں کو ختم کر دے، کہ ترکِ امید ہی اس سنسار میں کامیابی کی کنجی ہے، اس کے بعد وہی آواز کچھ اور تیز ہو رہی ہے اور اس کے دل میں، اس کی رگ رگ میں اس کے ہر بُن مو میں سرایت کرتی جا رہی ہے اور دمبدم وہی تقاضا ہے کہ تو زمانی زمان و مکاں نہ بن ؎

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

انسان کو کائنات اور ماورائے کائنات کی حقیقت سے آشنا کرانے والی آواز دمبدم اس کو جھنجھوڑ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ وقت جہد و عمل کا ہے، صرف عقیدہ و یقین کا نہیں، عزائم میں جاہ و جلال آنا چاہیئے:

اٹھ ذرا ذوقِ نظر سے کام لے
سوزِ دل سوزِ جگر سے کام لے

انسان کی تیرہ بختی کہیئے کہ جنت کی بہار سوگوار اور جہنم کی آگ راکھ کا انبار ہے۔ مکاں سے لامکاں تک سراب ہی سراب ہے۔ پانی کا نام نہیں انسانیت کے دریا خشک ہو گئے، اب ان کی جگہ ریت اور سراب نے لے لی ہے، انھی ریگ کے ذرّوں سے پانی نچوڑنا ہوگا، انھی سراب کے فریب دریا کو دریا میں بدلنا ہے اور یہ جہدِ مسلسل سے حاصل ہوگا اور جہدِ مسلسل کا اقتضا ہے کہ امیدوں کے فریب ہائے بے پایاں سے دامن بچا کر سعی جاری رکھی جائے۔

ابھی جو نقشہ کائنات کا سامنے ہے اس میں تو ہر جگہ انسانیت پر ماتم ہی ماتم ہوتا نظر آتا ہے، باغ ارم کی بہار بے برگ و بار ہے۔ شاخ طوبیٰ کا نکھار لُٹ گیا اور حوروں کی آنکھیں شرما گئیں :-

زلزلے سے عرشِ اعظم ہل گیا
طائر سدرہ کا شہپر جل گیا

انسان کی سیہ بختی نے زمین سے آسمان اور فرش سے عرش تک ماتمی چادر بچھا دی :

آسماں کا لُٹ رہا ہے اب سنگار
اب کہاں کا باغ اور کیسی بہار

حیات جن جن مشکلات سے گزر رہی ہے، وہ اپنی وسعت کھو کر سمٹتی چلی جا رہی ہے۔ انسان اب چھوٹے سے چھوٹے دائرہ کا ایک فرد، بلکہ آزاد نقطہ بن رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا :- "آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں'

گیت ہے لیکن کوئی سنتا نہیں
اور سنا بھی تو سمجھتا ہی نہیں

اب یہ آواز اپنی اصلی شکل میں گرجتی ہے۔ کہتی ہے کہ اے نادان، تجھ کو کیا کچھ نہ ملا، تجھ کو علم ملا، ذوقِ نظر ملا، شعور کا زیور ملا، فکر رسا ملی، جرأتِ پرواز ملی، ہمتِ جاں باز ملی، جہدِ عمل کی نعمت ملی۔ لیکن ترا یہ حال :

جرأتِ پرواز ہے کمزور سی
ہمتِ جانباز ہے مجبور سی
کیسی یہ قیدِ زماں، قیدِ مکاں

یہ مکاں تیرا ہے، یہ تیرا لامکاں

دیکھا آپ نے وہی مضمون ہے، جو اقبال اور اقبال کے بعد اتنے سارے حضرات کے دماغ میں آتا رہا۔ مگر بات کہنے کا سلیقہ یہ ہے کہ کہہ گئے اور خاموش بھی رہے کہ خاموشی ہی ہماری نجات ہے، اس نظم میں فن کے نمود کا اچھا ثبوت ہے تحریک شعری ایک گہرے ذاتی تجربہ کی علامت ہے، شاعرانہ کیفیت کس طرح مہمیز ہوتی ہے اور اس کے داخلی و خارجی اسباب و علل کیا ہیں۔ اس کا جواب شاعر کا داخلی اور خارجی ماحول ہی دے سکتا ہے۔ یہ پوری نظم شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے، جہاں الفاظ شستہ و واضح ہیں۔ لیکن معنوی ابہام نے اس کی رمزیت برقرار رکھی ہے اور اس طرح اس کی حلاوت بڑھا دی ہے۔

جہاں شعری حلاوت کی بات آگئی، تو بار دگر "آخری خط" پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ میرا مقصد علی سردار جعفری کی شاعری سے بحث کرنا نہیں ہے، مگر یہاں پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ "آخری خط"، یا "نئی دنیا کو سلام"، کوئی بھی ایسی نظم نہیں جو وقت کے دھارے کو سہہ سکے۔ ان میں شاعری اچھی شاعری کو اچھی طرح ذبح کر دیا گیا ہے، "آخری خط" جس کا نتیجہ یہ ایک مقصدی تحریک سے حرکت میں آتا ہے، تمام تر اسی مقصد کی گھن گرج میں گم ہو گیا۔ اس میں ایک مشرقی شوہر، مشرقی بیوی، ایک سرخ شوہر اور ایک سیاہ بیوی کی دھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے، جس میں جان نہیں، الفاظ کی قطار اندر قطار موجود ہے اور یہی مقصود بالذات ہے۔ مرنے کا جواز بھی نہیں، مرنا تو وقت ہی پر ہوتا ہے، مگر یہ موت اسٹالن کو خوش کرنے کے لئے ہے۔ بیوی کو اس عفیفہ کو دوسری آغوش کی زینت بننے کی وصیت کرنی یہ کس کو خوش کرنے کے لئے ہے؟ — ان سب اشارات کے باوجود

اشتراکی زندگی کی ناگزیری ہاتھ نہ آسکی، یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اشتراکی بن جانے سے یا سرخ پرچم پر قربان ہو جانے سے کس طرح زندگی سنور کر زمین کو آسمان کی بلندی عطا کر دے گی ۔ ہر ایثار اور جانی قربانی کے بعد ہمدردی اور مظلومی کا احساس جاگتا ہے۔ مگر اس نظم میں Pathos نام کو نہیں ۔ برخلاف کلیم صاحب کی نظم کے، اس میں طرح طرح کے تجربوں سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو انسان بننے کے لئے ساری روایتی بندھنوں کو توڑ دینا ہوگا اور خالص انسانی نظریہ سے انسانیت کی فلاح و بہبود کی راہ نکالنی ہوگی۔

کلیم صاحب نے ابلاغ و انتقال تجربہ کی ایسی راہ نکالی ہے جس سے حیات کے مثبت پہلو ہی روشن ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے منفی اثرات کے منکر نہیں مگر ان منفی اثرات سے وہ حیات کو مکدر نہیں بنانا چاہتے، یہ منفی پہلو ہی ان کے یہاں تعمیری رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے لہجہ میں جوش ہے، ان کے بیان میں توانائی ہے، بیان کی یہ شان اور تجربات کا یہ رجحان اس انداز سے پیش ہوا ہے کہ ان کی انفرادیت ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر ہمارے سامنے آگئی۔ تالستائے کا تعلق چونکہ امیر طبقہ سے تھا۔ اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ اسے غرباء کے دکھ درد کا احساس نہ ہوگا، مگر لوگوں کا یہ خیال غلط نکلا۔ کلیم صاحب کی بابت بھی دماغ کے کونے میں چوری چھپے یہ خیال جاگزیں تھا کہ وہ مفلوک الحال انسان کی تصویر کشی دیانت کے ساتھ نہ کر سکیں گے۔ مگر ان کے دونوں مجموعوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے دیانت کے ساتھ توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی اور ایک خاص سلیقہ سے اظہار خیالات کیا ہے، ان اشعار نے کلیم صاحب کی شخصیت کا وہ رنگ ہمارے سامنے

پیش کیا ہے۔ جس سے ابھی تک ہم سب محروم تھے۔ وہ شخص جو بھری محفل میں آئے بھی تو چپ چاپ آئے اور گم صم بیٹھ جائے، لوگوں کی سنتے رہے۔ اپنی اپنے دل میں رکھے رہے۔ کبھی کبھی باتیں کرنے والے کا جی گھبرا جائے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ایسے وقت میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس وقت قاضی عبدالودود صاحب سامنے ہوں اور کوئی دوسرا نہ ہو۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ ایسا شخص اپنے دل میں رنگینی و رعنائی اور اپنے تجربات میں شدّت و توانائی کے ایسے خزانے چھپائے بیٹھا ہے۔

اس کتاب میں ۴۴۲۴ مصرعے ہیں ——— اس مجموعہ کی نظمیں طویل ہیں۔ لیکن اس کی طوالت گراں نہیں گذرتی۔ فضل الرحمن مرحوم نے مقدمہ اُردو شاعری پر ایک نظر میں کلیم صاحب کی بابت کہا تھا "کثرت استعارات اس کے شاہد ہیں کہ مصنّف کی طبیعت شاعرانہ ہے اور احساس و ادراک بہت زندہ" وہ ان کے رفیق دیرینہ تھے، دوست تھے، ہمراز تھے۔ میرے خیال میں دوست اور بیوی اس اعتبار سے ایک سطح پر ہیں، دوست جلوت کا راز دار، بیوی خلوت کی راز دار ——— آج ہم مرحوم کے تاثر کی تصدیق بھی اپنی نظروں کے سامنے پاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا اسلوب علامتی رکھا ہے، نہ استعارات سے بہت کام لیتے ہیں، جن سے یہ نظمیں لامحدود فضاؤں کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ یہ علامتی انداز ایک خاص طرح کی براہ راست شاعری کی وضاحت پیش کرتا ہے۔ جس میں عمومی اپیل بھی ہے اور خصوصی دقتِ نظر کی دعوت بھی، انھوں نے کچھ نئے علائم بھی وضع کئے ہیں۔ نئی تشبیہیں اور نئی ترکیبیں بھی جن سے آہنگِ شاعری بلند ہوتا رہتا ہے۔ یہ آہنگ مغربی ہوتے ہوئے بھی مشرقی فضا قائم رکھتا ہے انھوں نے خارجی مشاہدات اور ذاتی کیفیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے

مگر ان میں مشاہداتی رنگ کے ساتھ تاثراتی رنگ اس طرح مل گیا ہے کہ ساری نظمیں ایک اکائی بن کر سامنے آجاتی ہیں، کوئی مصرع اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا، ہر مصرع ارتقائے خیال اور توثیق خیال کا کام دیتا ہے، تکرار خیال محض سے عام طور پر الگ تھلگ رہے ہیں۔ کسی خیال کو اچھے طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے کہیں کہیں جزوی تکرار ہے۔ مگر اس سے ارتقائے خیال کو مدد ملتی ہے :-

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

اس مجموعہ میں فن کلیم اعجاز کلیم ہے، اس میں زیادہ پختگی ہے اور کہنگی ہے۔ زبان منجھی ہوئی، صاف، حشو وزوائد سے پاک ہے۔ بیان شوخ و بے باک ہے۔ گرچہ یہ بے باکی اُردو داں طبقہ کے لئے بار گراں ہے۔ جو تجربے یہاں پیش ہوئے ہیں، ان میں بعض تو مشرقی ذہن کے منافی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر شاعر ان سارے تجربات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہوا، اپنی ذات کو ایسے وقت میں علیٰحدہ رکھ لینا آرٹسٹ کا کمال ہے۔ فوری تاثرات اور واقعات کی لذت سے اپنے کو بچاکر ہی ایک شاعر کوئی بیش بہا تخلیق کر سکتا ہے، فن کار نے ان تجربات اور اپنی ذات کے درمیان برابر ایک فصل قائم رکھا، اپنے نفس سے علیٰحدہ ہوکر دوسروں کے جذبات کی وضاحت اسے غیر مشخص بنا دیتا ہے، فراق نے جو برہنگی اور فحاشی کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے وہ ان کا مقصد ہے، وہ ان کا غیر شخصی تجربہ نہیں۔ ہندی شاعری میں اظہار محبت عورتوں کی طرف سے ہوتا ہے کہ محبت عورت ہے اور عورت محبت اور برہنگی بھی لازمہ محبت کے طور پر جنس کی پکار ہے جس کو بعض مذہب میں عبادت و عبودیت کے اظہار کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ اور

حق یہی ہے کہ اس بے ہنگی سے ہر شخص کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ خواہ وہ رند بادہ نوش ہو یا مولوی خرقہ پوش،۔

کلیم صاحب اس مجموعہ میں غزل کے شاعر بن کر سامنے آئے ہیں، مگر یہ غزلیں طویل ہیں، بعض تو ایسی ہیں کہ خفیف رد و بدل سے مثنوی بن جائیں۔ یا پھر غزل مسلسل انھوں نے غزل کا ایک نیا فورم دیا ہے، جو غزل کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے اس لئے ان نظموں میں طوالت کے باوجود ابہام ہے کہ ابہام غزل کی روح ہے یہ ابہام مغلق الفاظ اور پیچ در پیچ استعارات سے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ یہ ابہام سادگی اور پرکاری سے حاصل ہوا ہے، جو غزل کی پہلی ضرورت ہے۔

شاعر کے لئے ہر تجربہ خام مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ صرف اپنے محسوسات ہی کو بیان کرے۔ اس لئے ایک انسان کے لئے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ براہ راست سیلے تجربات حاصل کرے۔ ملٹن کو لیجئے وہ شیطان اور آدم دونوں نہیں ہو سکتا تھا، شکسپیر اوتھیلو ہے، کنگ لیر ہے، میکبیتھ ہے کیا ہے، کارڈیلیا ہے، ڈسڈیمونا ہے۔ پورشیا ہے کیا ہے۔ ارل آف گلاؤسٹر ہے یا اڈگر اس لئے کہ یہ دونوں دو متضاد فلسفہ حیات کے قائل ہیں، ارل آف گلاؤسٹر کہتا ہے:

As flies to wanton boys, are we to the gods
They kill us for their sport

اور اڈگر کہتا ہے:

The gods are just and of our plesant vices
Make instruments to plague us

ناشر :

کتاب منزل۔ سبزی باغ۔ پٹنہ ۴

پہلی اشاعت   اکتوبر ۱۹۶۷ء
تعداد اشاعت   ایک ہزار
قیمت :۔   تین روپے پچاس پیسے

مطبوعہ
لیبل لیتھو پریس۔ رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۴
کاتب : عبدالخالق سوز داناپوری

اللہ یہیں بنے گا مدفن
اِک شور اٹھا ہر ایک دل میں
ہر آنکھ میں آنسو ڈبڈبائے
سب نے اسے گور میں اُتارا

اختتام پر امید کی جوت جگمگاتا ہوا شاعر ایک نئی امنگ اور نئی ترنگ لے کر آتا ہے، یہ دنیا زیادہ دنوں تک ظلمت کا ڈیرا اور شر کا بسیرا بن کر نہیں رہ سکتی، یہ ہے امید مستقبل، جو ہر پیغام کو شاعر کے لئے ضروری ہے۔

دور افق پر دیکھو وہ کیا جھلک رہا ہے۔ شاید خدا پھر نمودار ہوگا۔ یوں کہیئے کہ وہی انسان، وہی مرد کامل پھر اُبھرے گا، اس لئے کہ ساری خدائی اشرار کی خدائی سے تنگ آ گئی ہے۔ خدا کا آخری سہارا لئے بغیر کائنات راہ نجات نہیں پا سکتی۔ ابھی انسان کو اس کی ضرورت ہے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

ہاں ہاں وہ دور اُفق کے پیچھے
مدھم سی کوئی روشنی ہے
ہلکی سی کوئی اِک کرن ہے
جو لمعۂ نور بن رہی ہے
جو شعلۂ طور بن رہی ہے

اب ہارڈی کی نظم کا سولھواں ٹکڑا پڑھیئے:

Where-of to lift the general night
A certain few who stood aloof had said
"See you upon the horizon that small light

یہیں سے انسان کے جبر و اختیار کا سوال پیدا ہوتا ہے، کہ وہ مجبوری مختار اور مختاری مجبور دونوں ہی کا شکار ہے:

میں کیا ہوں اور یہ مجبور دست و پا کیا ہیں
مرا خیال، مرا دل، یہ میری جاں کیا ہے
یہ اختیار پہ دیکھو تو جبر کیسا ہے

تجربات حیات اتنے متنوع اور متضاد ہوتے ہیں کہ کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان سارے تجربات کو خود ہی حاصل کرے۔ اصل یہ ہے کہ ان تجربات کو چاہے وہ ذاتی ہوں یا فرضی۔ جوش اور صداقت کے ساتھ محسوس کیا گیا ہو۔ یہ جوش اور صداقت ہر شاعر کے پلے نہیں پڑتی۔ یہ بھی ایک سعادت ہے اور خدا جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ کلیم الدین احمد اس فضل ایزدی کے اہل ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جوش اور زور کے باوجود جذبات پر ان کا قابو ہے وہ خود جذبات کے قابو میں نہیں چلے گئے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ انھوں نے شاعری میں تجربات بیان کئے ہیں، تجربات میں شاعری نہیں کی ہے اور یہ کہ تجربات میں شاعری کوئی پسندیدہ مشغلہ نہیں، جذبات کے قابو میں آجانے کے کئی مواقع اس مجموعہ میں آئے ہیں۔ جہاں تجربات و محسوسات میں تلاطم بپا ہوا ہے اور انھوں نے شعوری طور پر اس تلاطم کو سکون آشنا کرنا چاہا ہے۔ جہاں کہیں ایسا نازک مقام آیا ہے، انھوں نے زمین سے آسمان تک کی سیر کرادی ہے۔ تاکہ طبائع اپنے اپنے طور پر اس طوفان تخیل کو قابو میں رکھ سکیں۔ وہ خود کہتے ہیں "جوش ایسا نہ ہو کہ شاعر کے قابو سے باہر ہو جائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ طوفان جذبات و تصورات کو قابو میں رکھے، انھیں جانچے پرکھے اور تلاطم کو سکون کی شکل میں پیش کرے، اندر کوہ آتش فشاں

شعلہ بن ہو۔ لیکن سطح پر اتنا سکون ہو کہ حسین پھول کھلتے نظر آئیں"

یہ یاد رہے کہ پہلے جذبات کے سانچے بنتے ہیں۔ تب نقوش اور الفاظ کے جامے تیار ہوتے ہیں، یہ الفاظ شاعر کے اپنے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں، کبھی روایتی کبھی علامتی اور کبھی ذاتی۔ کلیم صاحب کے یہاں ہم اسی طرح کے الفاظ پاتے ہیں۔ اُردو غزل کو شعراء میں ولی، میر اور غالب نے اور موجودہ دور میں اقبال نے تینوں طرح کے الفاظ سے کام لیا ہے۔ اسی لئے ان کی غزلیں اکثر روایتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہو گئی ہیں، کلیم الدین احمد نے بھی الفاظ کی اسی تثلیث سے اپنے اشعار کو ایک مسلسل زندگی بخش دی ہے۔ ہیلڈرلن کہتا ہے کہ انسان کے پاس خدا کا سب سے خطرناک عطیہ زبان ہے اور یہ تحفہ اسے اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ بتائے کہ میں کیا ہوں انسان کو وجود میں آنے کے لئے پہلے اپنے وجود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور یہ اقرار زبان ہی سے ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنے وجود کا اعتراف جس زبان میں کیا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت سامنے آجاتی ہے اور ساتھ ساتھ ان کا بہاری ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے، اپنے اشعار میں انھوں نے ایسے الفاظ اور ایسے تیور سے بھی کام لیا ہے، جو سراسر بہاری ہیں۔ انھوں نے بغیر کسی جھجک کے بعض بہاری الفاظ۔ مثلاً دوسنا۔ سسرنا وغیرہ کا استعمال کر کے دکھا دیا ہے۔

الفاظ کی طرح مضامین بھی۔ روایتی، تجرباتی اور نفسیاتی مثلث میں ہمارے سامنے آتے ہیں، سارے مشاہدوں میں انھوں نے انھی تین رنگوں سے کام لیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سنجیدگی پر تین تہیں پڑ گئیں اور عریاں نگاری بھی تین گوشوں سے بے نقاب ہو گئی۔ اب اگر ہم کہیں کہ عریانش بغایت عریاں اور متانتش بارگراں است، تو حق بجانب ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ

انھوں نے ان سارے تجربات کو ایک تعمیری عمل کی صورت میں پیش کیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں بھی کلیم صاحب نے ڈرامیٹک مونولوگ سے کام لیا ہے، اس کو ہم شخصی گفتگو کہہ سکتے ہیں، جو کلام خود بھی ہو سکتا ہے اور کلام غیر بھی، اُردو شاعری پر ایک نظر کے تیسرے اڈیشن کے صفحہ ۵۳-۵۵ پر ڈرامیٹک مونولوگ کی صنفی خامیوں اور خوبیوں کا بیان ہے۔ جارج سٹیانا کے قول کا ترجمہ پیش کر کے کلیم صاحب نے یہ دکھلا دیا ہے کہ وہ بھی اس کو نیم وحشی صنف شاعری ہی قرار دیتا ہے، لیکن اس قسم کی انگریزی نظموں میں ایک واقعہ کا مسلسل بیان ہوتا ہے، جو روایتی غزلوں میں نہیں ہوتا، بعض لوگ جاپانی شاعری کی صنف ہائکو کو غزل کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ تماثل بھی درست نہیں۔ ہائکو میں زیادہ سے زیادہ چھ مصرعے تک ہوتے ہیں اور سب ایک دوسرے سے مربوط۔ اس لئے یہ صنف بھی بنیادی طور پر غزل سے منفرد ہے۔

کلیم صاحب بموجب اقتضائے فطرت اشعار مسلسل اور کلام مربوط کے قائل ہیں۔ وجہی نے بھی شعر کے لئے یہ امر مستحسن بتایا ہے: ؎

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس　　بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

مروجہ غزلوں میں یہ ربط و نظم ہاتھ نہیں آ سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایسا فورم اپنایا ہے جس میں مضامین بھی ہیں، معنویت بھی ہے اور تنظیم و ترتیب بھی، اُردو شاعری میں یہ ایک نیا اور پہلا تجربہ ہے۔ جس سے اس کے خزانے میں بیش بہا اضافے کی امید بندھتی ہے، عام طور پر یہ خیال چل نکلا ہے کہ غزل ایک طرح کی خود کلامی ہے۔ مگر کلیم صاحب اس خیال کے حامی نہیں اور اسی کی حمایت میں انھوں نے اپنے اشعار ڈرامیٹک مونولوگ کے انداز میں پیش کئے ہیں۔

کلیم صاحب کے یہاں مضامین کے برابر ہی الفاظ کی بھی اہمیت ہے، ہر خیال اپنے لئے ایک لفظ خود ہی منتخب کر لیتا ہے۔ اس لئے وہ الفاظ کی نوک پلک درست کرنے کے ساتھ نہیں۔ وہ انہیں راہ سمجھتے ہیں۔ منزل نہیں، اس لئے وہ اس طرح کے لوازم شاعری پر زیادہ دھیان دے کر تصنع کو دعوت نہیں دیتے مبادا راہ کی دلفریبیاں منزل کو گم کر دیں۔ حالانکہ "شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں، ایک فن ہے، ایک صناعی ہے"۔ مگر ان کا فن فطرت کی پکار ہے اور ان کی صنعت گری سہل ممتنع کی ایک شکل، رہا سوال قافیہ اور ردیف ان کے خیال میں شعر کے لئے یا غزل ہی کے لئے قافیہ کا التزام ضروری نہیں، اگر خیال نے ہم قافیہ مصرعے کہلوا دیئے تو ٹھیک، ورنہ قافیہ کی قید سے آزاد رہنا ہی مرغوب خاطر رہا۔

قدمائے محققین میں اس کی بابت خود اختلاف رہا ہے خود عرب کی قدیم شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان شعرائے قافیہ اور ردیف میں کس طرح کی آزادی روا رکھی تھی مگر کسی طرح بھی انھوں نے نغمہ اور موسیقی کو مجروح نہیں کیا کہ نغمگی شعر کی جان ہے۔ یہ نغمگی الفاظ، حسین، ناگزیر اور بے ساختہ زبان پر آئے ہوئے الفاظ سے پیدا ہوتی ہے، الفاظ اور تجربات میں ناخن اور گوشت کا تعلق ہے، جو اثرات ہمارے دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ کے ذریعہ ہی ذہن میں محفوظ رہتے ہیں اور ضرورت کے وقت خود بخود وہ الفاظ خیالات کا چولا لے کر آ جاتے ہیں۔ "اگر ہم فصاحت یا زبان کی پاکیزگی کے خیال سے ان لفظوں کو جو ہمارے تحت الشعور میں اُبھرتے ہیں۔ فصیح و پاکیزہ لفظوں سے بدل دیں، تو شاید فصاحت ہاتھ آ جائے۔ لیکن اثر زائل ہو جائے گا۔"

GHALIB ACADEMY (Hzt. NIZAMUDDIN)

Swelling some what?" Each mourner shook his head

کلیم صاحب نے اس نظم میں ہارڈی سے زیادہ باتیں بتائی ہیں۔ وہ مشرقی انداز زیست سے واقف ہیں۔ اس لئے ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد کے قاعدہ سے اپنی نظم میں تاثیر کی شدت پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

---

(۳) پہلی نظم کے بعد ہی ۲۷ مصرعوں کی یہ نظم ایک مناسب مقام پر معلوم ہوتی ہے، اس میں اتنے پہلو ہیں اور رمزیت کی اتنی تہیں جما دی گئی ہیں کہ یہ ہر مذاق رکھنے والوں کے لئے اپنی جاذبیت برقرار رکھ سکے گی، اس کی رواں موسیقی نے اور بھی دلکشی پیدا کر دی ہے، اس میں انسان کی ناآسودگی اور حقیقت سے کترانے کی عادت پر روشنی پڑتی ہے، وہ کوئی مقام ایسا تلاش کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ خدا کی خدائی سے الگ رہ سکے۔ مگر یہ ممکن ہی نہیں۔ پھیلتے ہوئے الحاد کے اس دور میں شاعر نے خدا کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو بڑے ہی شاعرانہ دلکشی کیساتھ پیش کیا ہے، شاعر کسی آواز سے اپنے قلب کی آواز سے چونکتا ہوتا ہے:

کون آتا ہے کون آتا ہے
یہ صبح کی سرد ہواؤں میں
اور شام شفق کے رنگوں میں
جنگل کے گھنیرے سایوں میں

.....

کون آتا ہے کون آتا ہے

شاعر نے اپنی شخصیت کو اس میں الگ رکھ کر دکھا دیا ہے کہ جذبات میں

خلوص ہونے سے کس طرح کی صداقت ہاتھ آتی ہے، انسان کا اعتراف گناہ اور احساس جرم اس کی متخیلہ میں ایک بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا واہمہ طرح طرح کی مہیب شکلیں گڑھ لیتا ہے اور جوں جوں ان سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ اور بھی خطرناک بن کر پیچھا کرتی ہیں اور پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ یہ فریب تخیل ہے (Hallucination) جو اس کو طرح طرح سے ڈرا رہا ہے۔ اس کا اندرون خدا کی نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا دماغ طرح طرح کے الٹے سیدھے نقوش کو زندہ اور جاندار سمجھ کر، ہیبت ناک نتائج سامنے لاتا ہے۔ انسان کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ وہ اشرف المخلوقات تھا اور اب ارذل الخلائق ہو گیا، وہ وعدۂ الست فراموش کر گیا۔ اس لئے اب اس کے نتائج اس کے سامنے ہیں اور وہ سر چھپانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اس لئے وہ ڈرتا ہے اور کہیں چھپ جانا چاہتا ہے۔ مگر کہیں اسے پناہ نہ ملی۔ وہ اپنا مجرم ہے۔ وہ خدا کا مجرم ہے، بلکہ سارے معاشرہ کا مجرم ہے۔

وہ دیکھ نہ لے، وہ دیکھ نہ لے
میں کیسے دکھاؤں منہ اس کو
میں شرم سے پانی پانی ہوں
اس نے تو ہزاروں پھول دیئے
اُودے، پیلے، لال اور اُجلے

میں نے انہیں توڑا پھینک دیا
میں نے انھیں مسلا، روند دیا

GHALIB ACADEMY
(Hzt. NIZAMUDDIN)

شاعر اپنے واہمہ میں ایک شکاری کو دیکھتا ہے اور گھبرا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود اپنی چیرہ دستیوں کے نشانات دیکھتا ہے اور ادھر ادھر راہ فرار کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے، مگر سب نے دھتکار دیا اسے اپنے آئینہ میں کثافت و دناءت کی تہیں جمی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ چمن میں جاتا ہے۔ کانٹوں سے مدد مانگتا ہے کہ پھول میں چھپنے کی اجازت مل جائے مگر پھولوں نے پھٹکار دیا، سوسن نے زبان درازیاں کیں، نرگس نے نگاہ بازیاں کیں، بات جہاں کی تہاں رہ گئی اور اُلٹے صحرا کے بگولے تک اس کا مذاق اڑانے لگے۔ انسان فطرت کی پرستش جس طرح چاہے کرے اور اپنے خالق کو جیسے چاہے بھول جائے۔ مگر یہی معبودان باطل اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اب اس کا واہمہ اور بھی ڈرا اٹھتا ہے اور ایک مہیب شکاری کی شکل سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تو اپنے ہر قول سے، اپنے ہر فعل سے اس وجود مطلق کا انکار کیا، اسکے احسان سے بیزاری ظاہر کی۔ اب کس مُنہ سے اس کا سامنا کروں۔

میں کیسے چار کروں آنکھیں
سرشار ع۔ا۔م اس نے دیئے
اور سر بفلک امیدیں بھی
کیسی یہ جواں ہمت بخشی

کیا کیا نہ عطائیں تھیں لیکن
میں نے ان سب کو نشتر کیا

وہ اسی حیرانی کے عالم میں خوف سے سہما ہوا صحرا کی طرف بڑھا وہاں

بھی یہی جواب ملا، دریا کی طرف گیا، دریا فرطِ غصہ میں موجزن ہوا، حباب بنے ابھرے اور اپنے موٹے موٹے دیدوں سے اسے گھورنے لگے، وہ بوکھلایا ہوا، افتاں خیزاں کوہ کے دامن میں پہنچا اور درخواست کی کہ اس ننگ وجود کے وجود کو سرمہ کی طرح پیس کر فضا میں اس طرح بکھیر دے کہ اس کا کوئی نام ونشان نہ رہے، اور اسے کوئی نہ دیکھ سکے اور نہ اس کا تعاقب کرے، مگر ایسا نہ ہوا۔ ..... وہ شکاری اس کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ اس نے چاہا کہ دھرتی پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ دھرتی بھی اس رہزن امانت کو اپنی آغوش میں لینے سے انکار کر گئی۔

یہ سینۂ گیتی شق نہ ہوا

اس کی جستجو اور حیرت ختم نہ ہوئی اب وہ شہپر فکر لگا کے زمین سے اوپر اٹھا کہ آسمانوں میں کوئی پناہ دینے والا مل جائے، بادلوں نے فریاد سنکر جواب میں آنسو برسائے۔ بے بسی کے آنسو، بجلیاں ہنس پڑیں، مجبوری کی ہنسی، مگر کوئی اس کے ننگے چہرے کو دامن میں چھپا نہ سکا۔ ضو بار فضاؤں نے خاموشی برتی، زرتار خلاؤں نے سکوت اختیار کیا، چاند بھی دکھ درد کا حال سُن کر مبہوت ہو کر رہ گیا، زہرہ، مریخ، عطارد، مشتری، سارے اچھے برے تاروں کے آگے دست سوال بڑھایا۔ مگر کسی نے اس کی نہ سنی، آخر میں بادشاہ فلک آفتاب سے مدد کی التجا کی، جواب ملا کہ سورج تو خود ہی اسی حقیقت منتظر کی منتظری میں سرخ سرخ آنسوؤں کی کرنیں زمین پر بکھیر رہا ہے۔ اس لئے وہ بے بس ہے، یہ بات اور ہے کہ سورج سرخ رُو ہے، اس لئے کہ جو ذمہ داریاں اسے سپرد ہوئی تھیں انھیں اس نے نباہ دیا۔ اب اس مجبورِ قسمت، پامال ہوس انسان کا خوف

اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کی مایوسی اپنے منتہا تک آگئی، اس کو ساری فضا میں، سارے خلا میں، ساری کائنات میں ہر جگہ رخشاں، سوزاں اور برّاں آنکھیں گھورتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ آخر مردہ تھک ہار کر اپنی زمین پر لوٹ آیا اور اس شکاری کے آگے سپر ڈال دی اور اپنے کیے ہوئے کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہو گیا اور اب وہ انسان خدا کی بنائی ہوئی مجبوری و مجبوری پر قانع ہو جاتا ہے:

میں دھرتی پر تب لوٹ آیا
اور اپنے شکاری سے یہ کہا
یہ دل بھی میرا حاضر ہے
یہ جان بھی میری حاضر ہے
ہاں شوق سے تیر اندازی ہو
وہ تیر لگے جو کاری ہو

قصۂ آدمؑ کو یاد کیجیے کہ وہ بھی گناہ کر لینے کے بعد بہشت میں جہاں بھی گئے، پناہ نہ ملی۔ جہاں گئے وہ جگہ ان سے دور بھاگنے لگی۔ بالآخر اپنے جرم اور عصیاں کا اعتراف کر کے نادم ہوئے اور اپنے رب کے حضور سربسجدہ ہوئے، پھر جو دعا مانگی مستجاب ہوئی۔ یہاں بھی جو وہ واہمہ والا شکاری نزدیک آیا، تو اس کی حیرت نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ وہ کمان بردوش اس کے سامنے آئینہ پیش کرتا ہے۔ وہ حقیقت منتظر تعاقب چھوڑ کر سامنے آجاتی ہے اور یہ راز آشکار ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ نہ تھا، وہی انسان خود تھا، وہ خود ہی عید تھا، وہ خود ہی عیّاد، وہی یزداں، وہی انسان، وہ اپنی تصویر سے

اور اپنے سایہ سے آپ ہی خوف کھا رہا تھا۔ وہ اپنی غفلتوں کو یاد کر کے اس واحد مطلق سے دور ہوا جا رہا تھا، ذرہ :

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرّے
جس کی خاطر تجھے تگا پو ہے

یہ نظم ابتدا سے انتہا تک حیرت زائیوں کا کرشمہ ہے، اس کی حلاوت دل و دماغ کو سکون بخشتی ہے، یہ سکون ایک اضطرابِ مسلسل کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے سراسر وجہ سرور بن گیا، علامتی انداز، استعارے، کنائے ایسے جال بچھائے گئے ہیں کہ بالآخر واہمہ شکار ہو جاتا ہے، بعض استعاروں میں اور بعض الفاظ کی بندش سے گلزارِ نسیم کی جھلک نظر آتی ہے، روانی ایسی کہ مصوری بھی حرکی ہو کر دلوں کو محو کر لیتی ہے۔ الفاظ ملائم، روزمرہ کے مستعمل ہونے والے کسی کے معنی یا کسی ترکیب کے سمجھنے میں دماغی کاوش نہیں ہوتی۔ ہندی الفاظ بھی سلیقہ سے لائے گئے ہیں۔ سرشارِ عزائم، لوحِ تخیل، زرنارِ خلا جیسے مرکب الفاظ شاعر کی قدرتِ بیان پر دلالت کرتے ہیں اس نظم کے بعض حصّوں سے غزل کا لطف آجاتا ہے، بلکہ غزل کا انداز تو اس طرح کھپ گیا ہے کہ ایسی غزل گلے لگانے کے لائق معلوم ہونے لگتی ہے۔

پوری نظم اقبال کے اس شعر

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمّتِ مردانہ

کی تصویر ہے عقلیت کے حدود میں رہ کر :

یہ میری کماں ہے تیری کماں

یہ میرے تیر بھی تیرے ہیں
تو صید بھی ہے صیاد بھی ہے
پھر کیوں تو مجھ سے گریزاں ہے

---

(۳) آج کی رات جو آئے ہو تو رہ جاؤ یہاں
اب مرے اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

دل آوارہ سے مراد عورت کا وہ محبوب ہے۔ جس نے اس کے ساتھ محبت کی اور اس سے وصل کی قربت رکھی۔ یہ نظم اسی ہجر و محبت عورت کی خود کلامی ہے، وہ عالم انتشار میں اپنے بکھرے ہوئے جذبات، و تجربات کو سمیٹتی ہے کہ وہی تجربات اس کی زندگی کا سہارا ہیں۔ وصل اور عالم اختلاط کا بیان تو ہر زبان کے ادب میں ملتا ہے۔ مغربی زبانوں کے علاوہ مشرقی زبانوں میں بھی ایسے بیان کی کمی نہیں۔ اردو و فارسی میں کیا اس کا ذکر کم ہے۔ عربی میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ تجربہ مرد کی زبانی بیان ہوتا ہے۔ مگر یہ نظم اُردو میں ایک نیا تجربہ پیش کرتی ہے اس میں عورت اپنی زبان سے وصل کا حال، عالم اختلاط کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ یہ ہماری ثقافت کے منافی ہے اور ایک حد تک ہندوستانی عورتوں کی توہین۔ مگر چونکہ جو خیالات اس میں ہمارے جذبوں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ عام زندگی میں صادق تجربات بنتے ہیں اور بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان میں کذب اور دروغ کا گذر نہیں اور یہی وجہ ہے، کہ ان جذبات کی صداقت نے ایسے بیان کو بھی قابلِ برداشت بنایا ہے۔

اس طرح کے خیالات ڈی۔ ایچ لارنس اور البرٹو مراویا کے یہاں بکثرت

ملتے ہیں۔ لارنس نے عریاں نگاری میں نفسیاتی مطالعہ پیش کرکے اس کو ایک فلسفہ بنا دیا ہے اور یہی فلسفہ اس کا فن ہوگیا، گرچہ یہ عریانی زاہدوں کے پاؤں بھی لڑکھڑا دے سکتی ہے، ایسے حصّوں میں مصنّف اور شاعر خود کو بالکل الگ تھلگ رکھتا ہے، یہ ڈرامیٹک مونولوگ کی وہ مثال ہے جہاں صرف دوسروں کی باتیں بیان ہوتی ہیں، جیمس جوائس نے زندگی کو خارجی طور پر پیش کیا ہے۔ یہ اس کا فن ہے کہ کردار کے دماغ میں جو الٹے سیدھے خیالات یا تجربات محفوظ ہوں، ان کو یاد کرے اور جوں کا توں بیان کردے۔ مسز بلوم نے جتنی باتیں بتائی ہیں اور جس طرح کے اعترافات گنا ہ کئے ہیں، ان کو پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ ایسے ٹھیٹ انداز میں اور اتنی تفصیل کے ساتھ، واضح بیان عورت کی زبان سے سُن کر پڑھنے والا کس طرح پریشان ہوجاتا ہے اور شاید ایسے بے باک، بیانات کو ایک نشست میں وہ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ ایسا کرنے میں کلیم صاحب فرائڈ سے بھی بہت قریب آجاتے ہیں، پراؤسٹ کی لے لا ریسیرچ میں بھی اسی طرح افراد کی اپنی گذشتہ زندگی کے تجربوں کا بیان ہے، رہ رہ کے دماغ میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اور بیتے دنوں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت ان یادوں کے سہارے تسکین حاصل کرنا چاہتی ہے، گرچہ نفسیاتی طور پر ایسے بیانات معصوم دلوں کو اپنی جگہ سے پھسلا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھسلا ہوا انسان سنبھل جائے۔ مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے، ایسے بیانات سے دل و دماغ اور جسم کی رگ۔ رگ میں تشنج اور خون میں حدّت بڑھ جاتی ہے اور رفتہ رفتہ کچھے دماغوں پر گرہی کا نقش ثبت ہو ہی جاتا ہے۔

یہ نظم ایک داستان ہے، آپ بیتی کہانی ہے کسی لڑکی کے تباہ ہونے کی۔ اعترافِ گناہ ہے بہ انداز معصومی، جیسے واقعات ناگزیر طور سے اسی نہج پر چل کھڑے ہوئے اور حالات نے خود بخود اس طرف کا رخ کیا ہو، جو جذبے آسودہ تجربے نہیں بنتے، دماغ میں محفوظ رہتے ہیں۔ اگر ان کو کسی اچھی راہ پر نہ لگایا جائے، تو وہ بغاوت کر بیٹھتے ہیں، یہ نظم اسی بغاوت کا ایک تور ہے، وہ لڑکی اپنے بیتے ہوئے سنہرے تجربات بیان کر کے کلیجہ مسوس کے رہ جاتی ہے کہ کیا ہوا، کیا ہونا تھا اور اب کیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ نئے منصوبے باندھتی ہے، اپنی محبت میں کسی طرح کی کمی کو وہ برداشت نہیں کر سکتی، اس لئے اس نے اپنے محبوب کو بھی زہر دیدیا اور خود بھی زہر کھا گئی، تاکہ محبوب اس کا برابر اس کے قریب رہے۔ اس نظم میں دوہرے قتل کو بیان کیا گیا ہے۔ براؤننگ کی ایک نظم ہے پرفیریاز لور Prophyrias lover، اس کا بھی اسی طرح کا قصہ ہے۔ پرفیریا ایک دولتمند لڑکی تھی، جو اپنے عاشق کے افلاس کے باوجود اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے دیتی۔ مگر عاشق کی مفلسی اور اس کی بدظنی نے اسے شک میں ڈال دیا کہ پرفیریا اس سے محبت نہیں کرتی ہے، چنانچہ اس نے ایک رات اس کو گلا گھونٹ کر مار دیا، اس قتل کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ اس سے خفا ہے، بلکہ جس طوفانی رات میں وہ اس کے جھونپڑی میں بھیگتی ہوئی پہنچی تھی اسے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا کی ساری خوشی صرف اس کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس کو اس کا یقین آگیا کہ پرفیریا اس سے سچی محبت کرتی ہے، اس محبت نے اس کو پاگل کر دیا، وہ اس خیال کو کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا کہ پرفیریا کسی

انتساب

(الحاج) مولوی سید حسن صاحب مرحوم ایڈووکیٹ
(گورنمنٹ پلیڈر) کے نام، جن کی خاموش خدمات ملک و ملت
رہ رہ کے یاد آتی ہیں۔

صدرالدین

دوسرے کے گلے کا ہار بنے، اس نے کہا کہ آج کی یہ گھڑی جب کہ پروفیریا اُس کی آغوش میں دادِ محبت دے رہی ہے کیوں نہ امر بنا دی جائے، تاکہ یہ محبت کبھی بھولی نہ جا سکے۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی اس نے اس کے لمبے لمبے بال کو اس کے گلے میں پھندا بنا کر اسے مار ڈالا، اس طرح اس نے اپنے وصال کی گھڑیوں کو دائمی بنا دیا اور اب اسے اس کا خوف نہ رہا کہ یہاں سے واپس جا کر اس کی محبوبہ کسی دوسرے کی آغوش کی زینت بنے گی۔

That moment she was mine, mine, fair
Perfectly pure and good : I found
A thing to do and all her hair
In one long yellow string I wound
Three times her little throat around
And strangled her—No pain she felt

اسی طرح براؤننگ کی ایک اور نظم ہے لیبارٹری Laboratory اس میں بھی اس نے یہی دکھایا ہے کہ ایک عورت ایک مرد سے محبت کرتی ہے، جس سے کوئی دوسری عورت بھی محبت کرتی ہے، چونکہ وہ عورت حسین ہے اس لئے اس کو خدشہ ہے کہ وہ عاشق اس سے چھن جائے گا۔ چنانچہ وہ ایک ڈاکٹر کی لیبارٹری میں جاتی ہے اور ایسی دوا زہر کی مانگتی ہے جس کو کھا کر انسان مرے تو ضرور، مگر آہستہ آہستہ موت آئے، وہ چاہتی ہے کہ اس عورت کو زہر دیدے، اس زہر کے عوض وہ اپنا سارا زیور اور اپنی ساری دولت دینے کو تیار ہو گئی۔ ایسا زہر لے کر وہ آتی ہے اور زہر سے اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔

اس نظم میں بھی اسی قسم کا تجربہ بیان ہوا ہے، عورت رشک کے جذبے سے

بھری ہوئی کہتی ہے۔ تم اگر میرے نہیں ہو تو کسی کے بھی نہ ہو۔ یہی خیال شرکت غیر کا ہے جس نے اس عورت کو ایسی بھیانک حرکت پر مجبور کر دیا۔ ورنہ نیت اس کی بھی صاف ہی تھی۔ وہ اپنے محبوب کو بار بار یہی کہہ رہی ہے:

آج کی رات جو آئے ہو تو رہ جاؤ یہاں
اب مرے اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

یہاں بھی اس عورت کی زندگی کا چراغ بجھنے کو ہے، بجھ رہا ہے۔ وہ لٹی ہوئی عورت اپنے عاشق کو بھی زہر دے چکی ہے، اب زہر دونوں طرف کام کر رہا ہے۔ ساری فضا اس کو تاریک معلوم ہو رہی ہے۔ اس کے عاشق کا جسم مردہ ہوا جا رہا ہے، مگر وہ خوش ہے کہ اس نے اپنے محبوب کو برابر کے لئے اپنے پاس رکھ لیا۔ دونوں بے جان ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں:

کیوں ہے اب سانسوں کی چلتی ہوئی تلوار خموش
کیوں ہے اب دل کی دھڑکتی ہوئی جھنکار خموش
دیکھو یہ گال مرے گال پہ بوجھل کیوں ہے
دیکھو یہ جسم مرے جسم پہ پتھر کیوں ہے
لو! مری آنکھیں بھی اب بند ہوئی جاتی ہیں

اپنے محبوب کو موت کے گھاٹ اُتارتے ہی وہ خود بھی مر جاتی ہے، معلوم نہیں اس نے خواب آور دوا کو خوراک سے بہت زیادہ قصداً پی لیا تھا، یا یہ فعل اضطراری تھا، بہرحال جو بھی تھا اب وہ محبوب کی جدائی کے دن کاٹنے کے لئے اس دنیا میں زندہ ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ خود اس کا محبوب بھی اس کو ستانے کیلئے زندہ نہ رہے گا۔ اور وصل کی یہ صورت یہ ایک کا دوسرے کی آغوش میں

ایک جسم کا دوسرے جسم سے متصل رہنے کا منظر دائمی اور ابدی ہو گیا۔

میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال'، یا میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان'، نسیم کی مثنوی گلزار نسیم، یا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' میں عالم اختلاط کو بڑے چٹخارے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس سے مقصود بالذّات لذّت کی فراہمی ہے۔ کسی میں بھی شاعر اپنی شخصیت کو مکمل طور پر علحدہ نہ رکھ سکا۔ خواب وخیال چنداں قابل گرفت نہیں۔ اس لئے کہ اس کے نام ہی نے اس کے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے، یہاں بھی وہی نفسیات کام کرتی ہے، یعنی ناآسودگی کا احساس۔ لیکن ساری جنسی تحریکات حباب کی طرح اٹھ اٹھ کر بکھر جاتی ہیں کہ یہ ساری داستان خواب ہے اور خیال۔ جوہری پھلواروی نے مثنوی گوہر جوہری میں اس منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ مگر بیان سنبھلا ہوا ہے اور چونکہ مختصر ہے اس لئے لذّتیت کا احساس قائم نہیں ہو پاتا۔ وجہی نے قطب مشتری میں اختلاط کی کیفیت بیان کرنے کے لئے ایک الگ عنوان ہی قائم کر دیا۔ صغیر بلگرامی نے فتنۂ عشق میں بڑی گھناؤنی تفصیل پیش کی ہے۔ مگر یہ سارے کے سارے تجربے مرد کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔

انگریزی ادب میں عریانی کو ایک فن کے طور پر برت کر دکھایا گیا ہے، یہ عریاں نگار فن کار اپنی دیانت، تخئیل اور وضعداری کا بڑا پاس رکھتے ہیں اس لئے کہ آرٹسٹ کی Integrity (صلابت کردار) بہت اہم ہوتی ہے۔ کسی نقاش کو اگر کوئی یہ کہے کہ تمھاری بنائی تصویر عریاں ہوئی جاتی ہے، تو وہ محض اس خوف سے نہ تو اپنے عقیدہ کو بدل دیتا ہے اور نہ اپنے نقش کو مبہم ہونے دیتا ہے۔ بلکہ وہ حسن کے ہر خط وخال کو دکھلا کے رہتا ہے، اسی طرح شاعر

یا نثر نگار ادیب اگر یہ سمجھیں کہ یہ سارے ننگے تجربات آئے دن پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ خواہ کوئی زبان سے کہے یا نہ کہے، تو ان ننگے تجربات کو وہ بلا خوف لومۃ لائم بیان کرنے سے ڈرتے نہیں۔ چوسر نے ایسا ہی کیا۔ فیلڈنگ کی ٹام جانس کو لیجئے۔ آرتھر ملر کی کتابوں کو لیجئے، سب میں تیکھا، تلملا دینے والا عریاں بیان ہے اور لوگ انھیں بھی پڑھتے ہیں کہ سماج کے ایک اہم تقاضا کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ یہاں عریانی مقصود بالذات نہیں۔ یہ عریانی تلازمہ داستان اور تلازمہ محبت کے طور پر پیدا ہو گئی۔ عورت تو اپنے جذبات ایک ایک کرکے یاد کرتی ہے اور بیان کرتی ہے۔ اپنے لئے اپنے محبوب کے لئے دوسروں کے لئے نہیں، وہ تو اسی سے مخاطب ہے اور اسی سے گلے شکوے کا سلسلہ جاری ہے اور جو سلسلہ اب ہمیشہ کے لئے بند ہونے والا ہے۔

شاید اس عریانی اور جنسی تعلق کی دہائی دے کر کہ یہی عفت عورتوں کا سرمایۂ حیات ہے، وہ بد نصیب عورت اپنے محبوب کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ اس نے تو محبت میں وہ سب کر ڈالا، جو نہ کرنا تھا، مگر اے محبوب تم نے اس ایثار کی قدر نہ کی۔ یہ ایثار پہلی بار استعارے اور کنائے میں بتایا گیا ہے، گرچہ یہ کنائے بھی واضح ہی ہیں۔ مگر اس میں عریانی کے باوجود ایک سنجیدگی ملتی ہے:

جسم تھا جسم کہ اک روح کا انگارا تھا
ساری دنیا انھیں جسموں میں سمٹ آئی تھی

بار دگر اس ایثار کا ذکر ملتا ہے، عورت وفور جذبات میں مدہوش ہے وہ خیالات میں، اپنے شیریں تصور رات کی آغوش میں مچل رہی ہے اور اس کی زبان پر یہ جملے آ ہی گئے: (۱) "پھر ہوس کا تھا وہی بھوت، وہ شہوت کا جنوں

(۲) وہی سنگین سلاخ الخ:۔ (گرچہ ان دو مصرعوں کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا) ایک امر قابل غور ہے کہ یہ بیان ٹھیٹ اور ننگا ہے، لیکن اسی حد تک ہے جس حد تک فطرت کا تقاضہ تھا، اس بیان میں لذت کو برقرار رکھنے کے لئے طوالت سے کام نہیں لیا گیا ہے اور عام اختلاط کی کیفیتوں کا ذکر مطلق نہیں ہے۔ یہاں عورت کی فطری شرم نے اس منظر کو دیر تک رہنے نہ دیا اور اس نے اپنی بھولی بھالی تباہی کا معصوم وضاحت کے ساتھ ذکر کر دینے پر اکتفا کر لی۔ یہاں صرف یہی کہا گیا: ع 'حسن غریباں کو مرے تم نے جو غریباں دیکھا'

گرچہ یہ تخیل نے طرح آگے راہ ڈھونڈے ہے، مگر جیمس جوائس نے تو کمال کر دیا۔ مسز بلوم کی زبانی ایسے بے پردہ الفاظ، بے پردہ خیالات پیش کرتا ہے کہ معصوم دماغوں کی رگ رگ جنسی تقاضوں سے جھنجھنا اٹھے۔ یہ فرق ہے مشرق و مغرب کا، جو لاشعوری طور پر یہاں بھی کارفرما ہے۔

ہارڈی نے بھی اپنی ہیروئنوں کی عصمت کو لٹتے ہوئے دکھایا ہے اور اسی حقیقی دنیا میں سارے کرشمے پیش ہوئے ہیں، وہ خواب کی دنیا میں ایسی لذت حاصل ہونے کے خلاف ہے۔ اس نے سماج کا، اپنے سماج کا، آئینہ بغیر کسی غلاف کے سامنے رکھا ہے۔ مگر ہیروئنوں کی عصمت برباد ہونے کے بعد غم و غصہ کو بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فعل قدرت کی نگاہ میں مذموم اور مقہور ہے۔ ناول ٹس Tess کے یہ آخری جملے پڑھیے:

Justice was done and the President of the immortals in Aescylean Phra se had ended his sport with Tess.

یہ نظم انتظار و یاس اور پھر امید و کامرانی کے محور پر گھومتی ہے۔ اس میں غزل کے مضامین بکھرے پڑے ہیں اور شاعری کے لحاظ سے بعض مصرعوں میں بڑی پختگی اور وسیع نگاہی سے کام لیا گیا ہے۔ استعارات، اشارت انگیز ہیں۔ اس میں احساس کی شدت بھی ہے اور اس پر قابو بھی۔ سارے محسوسات کو خارجی صورت میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ اس میں اقبال کے بعض سنجیدہ مصرعوں کو اپنے مطلب کے مطابق ڈھال کر، تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ طبیعتوں کے تکدر کا سامان کر دیا گیا ہے۔ مرے قرآن الخ، اور مرے کعبہ کو الخ۔ یہ دونوں ٹکڑے ذوق سلیم پر گراں ہیں۔ مگر یہ سب ایک مرنے والے کی باتیں ہیں۔ ایک فاتر العقل کی زبانی، اس لئے قابل گرفت نہیں۔ دو مصرعے جوش کے بھی ہیں اور چند مصرعے فیض کے۔ لیکن سرسری گذر جایئے، معلوم نہ ہو سکے گا کہ کسی دوسرے کے مصرعے پڑھ گئے۔ اس میں ۲۱۳ مصرعے ہیں اور ہر مصرع اس نظم کا لازمی جزو ہو گیا ہے۔

یہ نظم ایک عورت کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس میں عورت کی بے بسی، جنسی تقاضوں کے چھپانے کی عادت، چھیڑے جانے کی خواہش ان تقاضوں کے جاگ جانے کی فطرت اور جب جاگ گئے، تو جاگے رہنے کے تقاضوں کی، اس کے انتظام پر ورمیلان کی اور اس کی اندھی محبت کی نفسیاتی تحلیل ہے، اس کی ابتداء تندی انتظار سے ہوتی ہے، یہ انتظار مایوسی میں بدل جاتا ہے، بالآخر ایک ابدی خاموشی چھائی جاتی ہے:

کیسی سنسان سڑک ہے مرا آنے والا
تیز اور تند ہواؤں کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ شدت یاس اس کے تحت شعور کو مہمیز کرتی ہے اور وہ بیتے دنوں کے

سہلے تجربوں کی یاد کر کے اپنے دلِ زار کو تسکین دینا چاہتی ہے۔ اس میں ہم فیض کی نظم تنہائی کی دھمس پاتے ہیں ع 'کوئی آتا ہے دل زار۔ نہیں۔ کوئی نہیں' مگر فیض قوت تعمیر کی کمی کے باعث اس کو زندہ جاوید تجربہ بنا کر پیش نہ کر سکے، یا اگر یہ تجربہ بنا تو اسے پیش کرنے کی انھیں ہمت نہ ہوئی، فیض کی نظم 'انتظار' سے بھی اس نظم کا کچھ رشتہ جوڑا جا سکتا ہے، اس لئے کہ بقول کلیم الدین احمد "جہاں انتظار کی انتہا ہوتی ہے، وہیں اس نظم کی ابتدا ہے" (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم ص ۳۳۴)

اس نظم کا محاکاتی انداز اس کو دھیرے دھیرے خروجِ خیال کی طرف لے جاتا ہے اور اس درمیان جتنی کڑیاں ہیں، یا جتنے تجربے ہیں سب وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نظم دراصل انتظار، تنہائی اور آسودگی و بیزاری کا مجموعہ ہے۔ تنہائی پر ایک چھوٹی سی نظم پیام مشرق میں بھی ہے، مگر اس کا افق ہی کچھ اور ہے۔ شاید اس نظم کا ہلکا پرتو ۴۲ نظمیں کی نظم نمبر ۲۲ میں ملتا ہے۔ اس پر خفیف سا اثر آرتھر سائمنس کی نظم دی بروکن ٹرسٹ اور ہارڈی کی نظم دی بروکن اپوائنٹمنٹ کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے مجاز کی نظم 'آوارہ' بھی ذہن میں رہی ہو۔

شوق قدوائی کی مثنوی عالم خیال سے بھی اس کے بعض مصرعے سے متاثر ہیں۔

---

(۴) مجھے شعر کہنے کی فرصت کہاں ہے
مری زندگی اک مسلسل غزل ہے

مری سانس میں شعر پلتے ہیں دیکھو
لہو میں مرے شعر اُبلتے ہیں دیکھو

---

۱۹۰ مصرعوں کی یہ مختصر نظم اُردو میں لیرک (غنائی شاعری) کا ایک خاص تجربہ پیش کرتی ہے، اس میں سلسلہ وار خیالات کی ایک زنجیر بنا دی گئی ہے۔ اس میں ایک مرکزی تخیل بھی ہے اور ارتقائے خیال بھی ہے۔ کچھ لوگ لیرک کو غزل کہتے ہیں، مگر لیرک دراصل غزل نہیں کچھ اور ہے۔ جہاں تک نغمگی کا تعلق ہے غزل لیرک سے مشابہ ہے۔ لیکن تسلسل خیالات مروجہ غزلوں کے بس کی بات نہیں۔ لیرک میں جو تجربہ پیش ہوتا ہے، وہ مکمل ہوتا ہے اور ڈرامیٹک مونولوگ میں جو تجربہ پیش ہوتا ہے، وہ مکمل نہیں ہوتا، بلکہ درمیان سے ایک واقعہ چُن لیا جاتا ہے، جس کی نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم۔ لیرک کا تجربہ اکہرا ہوتا ہے جیسے مختصر افسانہ میں ایک ہی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہی حال لیرک کا ہے۔ لیرک میں سادگی، بنیادی ضرورت ہے۔ الفاظ ایسے کہ ترنم پھوٹ پڑے۔ انگریزی میں ہارڈی نے بکثرت لیرک لکھے ہیں، اور تقریباً ہر لیرک میں وہ کامیاب ہوا ہے۔

یہاں شاعر نے روایتی غزل گو شعرا کی بڑی خبر لی ہے۔ ان کی خیالی دنیا کی خوب مذمت کی ہے، ان کے کذب، ان کے مبالغہ، ان کی ہوائی باتوں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا خود بخود پرانی غزلوں سے متنفر ہو جائے۔ وہ بیجان تعریفیں، جھوٹے ڈھکوسلے، اور بناوٹی محبت کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں:

خیالی محبت، خیالی سراپا
انھیں شعر کہنے سے فرصت کہاں ہے

بہ میں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔ ان روایتی غزل نگاروں کو شعر کہنے سے فرصت نہیں اور کلیم صاحب کو شعر کہنے کی فرصت نہیں۔ مگر شعر دونوں ہی نے کہے اور دونوں اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ برابر ہی یاد رکھے جائینگے۔

شاعری کی بنا پائدار انسانی تجربوں پر ہے۔ تفریحی شاعری یا نشاطی شاعری جو وقتی تحریکات کا نتیجہ ہوتی ہے، وہ شاعری نہیں ننگ شاعری ہے۔

کلیم صاحب نے شاعری کو افضل ترین فن لطیف بتایا ہے، وہ انسانی کامرانی کی معراج ہے اور انسانی تہذیب و تمدن کے سر کا تاج ہے، شاعری موسیقی سے افضل ہے، کہ موسیقی کائنات اور زندگی کے ہر رخ کی عکاسی نہیں کر سکتی، وہ نقاشی سے بھی افضل ہے۔ اس لئے کہ اس کے مجسمے حسین تو ہوتے ہیں۔ مگر سرد اور بے جان۔ نقاش، پتھر کو زبان نہیں دے سکتا لیکن شاعری میں کائنات کی لامتناہی وسعتیں سما سکتی ہیں، ایسی شاعری، خون جگر سے پلتی ہے اور روایتی غزلیں تصنع اور مکر و فریب کا دودھ پی پی کر جوان ہوئی ہیں۔ شاعر نے اپنے شعر کو حسین و جمیل مجسمہ میں تحویل کر دیا ہے، اس کا محبوب حقیقی ہے۔ خیالی نہیں، اس کی محبت گوشت و پوست کی حدت لئے ہوئے صداقت کی دلیل ہے۔ اس کا محبوب، مجسم حقیقت مجسم فسانہ ہے۔ اس لئے حقیقت کی صلابت اور فسانہ کی حلاوت دونوں ہی اس کی ذات میں شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ اس غزل حقیقت میں سراپا نگاری کی لذت مل جاتی ہے، سراپا نگاری ایک فن ہے۔ دشوار فن ہے، یہ محبوب کے ہر عضو کے بیان کا فن ہے۔ اس لئے یہ فن کی آزمائش کا فن ہے، یہاں قد و قامت سے زیادہ اس کی رعنائیوں کا بیان ہے، وہ سینہ مصفا، وہ دو قبۂ نور، جامی کے انداز بیان کا اثر ہے۔ ؎

دو پستانش یکے از قبۂ نور
حبابے خاستہ از عین کافور

اسی طرح، یہ مصرع:

ز زیر ناف تا بالائے زانو
نگویم نکتۂ زان کہنہ یا نو

لیکن اڑے سے لرزاں، کھڑے سے گریزاں کا ٹکرا ذرا شوخ ہو گیا ہے۔ شاعر غزلی ہے، عرف باتیں بنا کر اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔

میں لفظوں کے جنجال سے بھاگتا ہوں
طلسموں کو رنگوں کے میں توڑتا ہوں
میں کیوں سخت پتھر سے سر اپنا پھوڑوں
مری تنگ آغوش میں یہ غزل ہے

آخری بند کا یہ مصرع 'میں دل بیچتا ہوں، میں دل بیچتا ہوں'، زیادہ کھپ نہ سکا اور جوش ہی کا مصرع بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور گورمکھ جائیں کا ٹکرا اکبر کے ساتھ اس طرح بدنام ہو گیا ہے کہ یہ کسی طرح بھی چھپ نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ میر اور غالب دونوں ہی کے بعض مصرع کا پرتو ہے، بلکہ میر کا ایک مصرع تو یہاں کلیم کا مصرع بن گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم، نظم بھی ہے اور غزل بھی ہے۔ اس غزل کو جان بھی عطا ہوئی ہے، یہ وہ غزل ہے جو شاعر کے ساتھ برابر ہے، جو غزل ہی نہیں بلکہ غزلوں کا سرچشمہ ہے۔ آخر میں وہ اس جانِ غزل سے سوال کرتا ہے۔ جو میں نے سنائی یہ کیسی غزل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ غزل، اصلی غزل ہے، جس پہ یہ روایتی

مولوی سید حسن صاحب (ایڈوکیٹ)

غزلیں جتنا بھی رشک کریں کم ہیں۔ اس میں جتنے مشاہدے بیان ہوئے اور جتنے استعاروں سے کام لیا گیا ہے، وہ شاعر کے عمیق تجربات کی بیّن دلیل ہے۔ زبان نرم، نازک، رواں اور سہل، موسیقی ایک ایک فقرے سے اُبلی پڑتی ہے، پھر سارے خیالات موتیوں کی لڑی بن کر دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں:

کلیم! آپ کی یہ غزل در غزل ہے
ہر اک لفظ ہر تجربہ برمحل ہے
غزل کا ہے تیور، غزل کا ہے لہجہ
غزل کے معانی پہ یہ مشتمل ہے
تغزّل، تسلسل، حقیقت فسانہ
غزل کہنے والوں کے ابرو پہ بل ہے

جگن ناتھ آزاد نے بھی غزل میں حقیقت نگاری کی ہے۔

اے غزل کو غم محبوب سمجھنے والے ❊ یہ جواب میں نے سنائی ہے غزل ہی کہ نہیں

---

(۵) اس نظم میں آدم کا قصہ، وہ رنگین و جاوداں حکایت بیان کی گئی ہے۔ جبکہ آدم جنّت میں رہا کرتے تھے۔ شیطان نے بہکایا، پھسلایا اور حضرت حوّا کو نافرمانی پر اُبھارا، جس کی سزا حضرت آدم کو یہ ملی کہ بہشتی معصومی ان کی چھن گئی اور وہ عریاں ہو گئے، آدم نے دعا مانگی، مقبول ہوئی اور وہ زمین پر پھینک دیے گئے، یہ قصہ مذہبی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لئے آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر ہے، قرآن پاک میں بھی اس کا بیان ہے، چونکہ عقیدوں کی درستگی اور آدم کی

بلند منصبی ظاہر کرنے کے لئے قصۂ آدم و ابلیس بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے قرآن میں کئی بار اس کا ذکر ہے۔

ملٹن نے پیرڈائز لوسٹ Paradise Lost میں اس داستان کو بڑی عقیدت مندی سے بیان کیا ہے۔ چونکہ اس کا کینوس طویل ہے۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ یہ قصہ سارے لوازم و عواقب اور آدم کے ردعمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کتاب میں ابلیس کا کردار کچھ ایسا شاندار ہو گیا کہ وہ آدم کے کردار پر حاوی سا معلوم ہونے لگا، چنانچہ ملٹن نے پھر پیرڈائز ریگینڈ Paradise Regained لکھ کر اس کی تلافی کرنی چاہی مگر دل کی بات دل میں اثر کر چکی تھی۔ یہ تلافی کامیاب نہ ہو سکی اقبال نے بھی ان قصوں کو مختصر نظموں میں بیان کیا ہے، بال جبریل میں دو نظمیں اس طرح کی ہیں (۱) فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں (۲) روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، پیام مشرق میں اس قصہ کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے (۱) تسخیر فطرت (میلاد آدم)۔ (۲) انکار ابلیس (۳) اغوائے آدم (۴) آدم از بہشت بیروں آمدہ (۵) صبح قیامت (آدم در حضور باری) جوش نے ایک طویل نظم میں خلقت آدم اور مکالمہ ابلیس و یزداں کا ذکر وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ کلیم صاحب کی یہ نظم ان ساری مذکورہ نظموں کا نچوڑ ہے۔ لیکن انھوں نے اس میں کچھ اور بات بھی بتائی ہے۔ اس نظم کو ۲۴ نظمیں کی نمبر ۲۲ نظم کے ساتھ پڑھیے تو پتہ چلے کہ یہ نظم بھی اسی طرح سے ارتقائے حیات پر روشنی ڈالتی ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ارتقا پذیر ہے: ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ۔۔۔ کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

یہ دنیا خلقت کے ارتقا کی ایک علامت ہے۔ ہر شئی ترقی کی طرف گامزن ہے۔

اور کوئی شئی ابھی منزل مقصود تک نہ پہنچ پائی ہے: سہ

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی ؎ نقشِ گرِ ازل ترا، نقش ہے ناتمام ابھی

خود خدا ابھی ارتقا پذیر ہے۔ اس لئے کہ خود انسان ابھی اپنی مقسوم بلندیوں تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ یہی سرعزیز ارتقا ہے۔ جس نے اس جال کو بنایا، وہ بھی اس جال میں پھنسا ہے۔ اس کو ابھی سرآدم بتانے کی ضرورت ہے۔ یہاں بھی ہارڈی کی نظم گوڈس ایجوکیشن Gods Education کا اثر نمایاں ہے۔

اس نظم کا یہ مصرع، دل کا، جاں کا زیاں ہے جنّت، جو ٹیپ کا مصرع بن گیا ہے۔ غالب کے اس خیال کی ایک تصویر ہے:

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت غالب ؎ دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

ایک جماعت کا یہ خیال ہے کہ ابلیس کوئی الگ شخصیت نہ تھی اور سانپ کوئی الگ ہستی نہ تھی۔ سانپ حوّا کی کالی کالی زلفیں تھیں، جن کی مستانہ اداؤں نے آدم کو بہکایا اور وہ حوّا سے جنسی انصال کر بیٹھے اور شاید اسی سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تھا کہ یہی خواہش انسان کو تباہ کر دینے والی ثابت ہوگی، اور اسی دیوار عناصر میں سارے فتنے اسی سے اٹھا کریں گے، اس نظم کا پہلا مصرع جو سارے خیالات کا ایک حد تک ضامن ہے، اسی طرح کے نظریہ کی طرف لے جاتا ہے:

یہ مارِ سیاہ زلف دیکھو
سرگوشیاں مجھ سے کر رہا ہے
کہتا ہے کہ چھوڑ دو ایسی جنّت
جس میں ذوقِ نمو نہیں ہے

"تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل ؎ چیست حیات دوام سوختن ناتمام

یہی ذوق نمو سوختن ناتمام کی مسلسل کوششوں کا نام ہے۔ کیا آدم کیا یزداں ذوق نمو سب میں ہے۔

یہ نظم ۲۳۹ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مار سیاہ زلف کی فریب کاریوں کا حال بتایا گیا ہے۔ کومس Comus کی طرح شاعر جنت کے سارے فرحت انگیز نظارے کو انسانی مسرت کے شرارے بتا رہا ہے، سانپ کو اتنی طاقت گویائی کا مل جانا بھی ابتدائے خلقت کا فسانہ ہے، ابلیس معلم الملکوت تھا۔ اس کی طلاقت لسانی پر خود یزداں کو خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ جب اس نے جواب دیا خلقتنی من نار وخلقتہ من طین (اے اللہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے بنایا) یہاں سانپ کی منطق اور اس کی چکنی چکنی باتوں میں آدم اس طرح محو ہو گئے کہ اپنا وعدہ اور فرمان خداوندی بھول گئے۔ یہ تھا عورت کا پہلا کرشمہ۔ ہاں تو مار سیاہ زلف کہہ رہا ہے کہ جنت، جنت ہے، بس ایک طرح کی خاموشی ہے، یہاں دودھ کے چشمے ہیں، شہد کی نہریں ہیں، چاندی کے حسین دریا ہیں۔ سب کچھ ہے۔ لیکن "دل کا، جاں کا زیاں ہے جنت" ہر رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں، ہر طرح کے پھل پکے ہوئے تیار ہیں۔ اشجار کی فوج صف آراستہ ہے۔ ایسے ایسے پھول نظر آ رہے ہیں، جو ساتوں طبق آسمان کے مناظر پیش کر رہے ہیں، ایسی رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں، جن کو ہمارا لوح تخیل نہیں پا سکتا، لیکن یہ سب آرام اور سکھ بیکار ہے۔ یہاں تو دل گداز کی نعمت نہیں۔ اس نعمت کی محرومی سراسر زیان انسانی ہے، طرح طرح کے طیور نغمہ خواں ہیں۔ ان کے نغمے شیریں اور رسیلے ہیں۔ لیکن یہاں تو دل ہی نہیں جس میں گدگدی پیدا ہو۔ وہ حس نہیں جو شوق پرواز عطا کرے، وہ اضطراب نہیں، جو فکر جستجو پیدا کرے۔ ان طیور کے نغموں میں وہ حرارت نہیں، جو

خون جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں حرارت چاہیئے تاکہ یہ چار یار کی دیوار قائم رہ سکے۔ ان چار عناصر کا تقاضہ ہے، تغیّر، تبدل، تلوّن اور پھر فنا۔ مگر یہاں تو ابدیت ہماری عبدیت کے مزے کو کرکرا کر رہی ہے۔ ہر چیز دائم قائم ہے۔ پھول مہک رہے ہیں، تو برابر مہکے جا رہے ہیں، چڑیاں چہک رہی ہیں، تو برابر چہکے جا رہی ہیں، کہ یہی حکم ایزدی ہے:

جو پھول ہے، پھول ہے ہمیشہ
جو رنگ ہے رنگ ہے ہمیشہ
نغموں کا سرود ہے ہمیشہ
چشموں کا رود ہے ہمیشہ
مطلق نہیں وقت کو اجازت
اس بزم ابد میں بار پائے

فرشتوں کے ہاتھ میں تسبیح ہے تو ہے۔ اسرافیل کے ہاتھ میں صور قیامت ہے تو ہے، بظاہر سب تعمیل حکم میں مشغول ہیں۔ لیکن اندرونی طور پر اس یکسانی سے سب اُکتا گئے ہیں اور شاید خدا بھی تو اس یکسانی سے اُکتا کر ہی آدم کو تخلیق کرنے پر مجبور ہوا تھا کنتُ کنزا مخفیا فاحببتُ ان اُعرف فخلقت الخلق (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ دوسرے مجھے پہچانیں، تو میں نے مخلوق بنائے) پس یہ ہنگامہ ارتقا دیکھنے کی خواہش سبھوں کے دل میں سمائی ہوئی ہے۔

سر ہیں کہ رکوع میں جھکے ہیں
سجدوں میں جبینیں بھی پڑی ہیں

ہم نیایند تو غیر سجود نیاز ٭ خیز جو سرو بلند اے بعل نرم گام

دنیا ہر طرح سے بنی ٹھنی، نکھری، سنوری نظر آ رہی ہے، اس میں بھی نت نئی رنگینیاں ہیں، موجیں ہیں، چشمے ہیں۔ ہر طرح کی دلفریبیاں ہیں اور دلفریبیوں کو محسوس کرنے والا دل بھی ہے۔ اس عالم ملکوت میں، مکان ہاہوت میں دل کہاں جو دھڑکے:

آؤ اس دل پہ ہاتھ رکھو
آؤ دھڑکن کو اس کی دیکھو

آؤ، اپنی جنت سے نکلو بھی، یہاں گو ہر طرح کا آرام ہے، مگر آرام اس چار یار کے جسم کو راس آنے والا نہیں، اس کی تو فطرت میں حرکت ہے، حرارت ہے، لطافت ہے، کدورت ہے، آرام، آرام اس کو آرام نہیں چاہیے ہمیں اپنے زور بازو سے کام لینا چاہیے، ورنہ یہ بازو آخر ملے ہی کیوں ع
'اک مرگ دوام ہے یہ آرام'۔ ے

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام :: فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام

جنّت کی پُر سکون حیات آدم کی طبیعت کے منافی ہے۔ زندگی کا لطف حاصل کرنا ہے، تو اس سکون کو خیر باد کہیں۔ اپنی موت کے خواہاں بنیں۔ اپنی خواہش اور مرضی کو جنم دیں۔ دوسروں کے اشارے پر چلنا آدم کی توہین ہے۔ یہ ازلی فدویت آدم کی توہین ہے: ے

تیغ درخشندۂ جان جہانے گسل جوہر خود را نمائے برون از نیام

طوفاں سے ذرا اُلجھ کے دیکھو
موجوں کے تھپیڑے سہہ کے دیکھو
بندے ہو خدا تو بن کے دیکھو

زمین پر جاؤ گے تو ساری زمین تمہاری ملکیت ہو گی۔ تم اس پر حکمرانی کرو گے، ذرا فرمان روائی کا لطف تو اٹھاؤ،

اِنّا جعلناکَ خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس (ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا، پس تم لوگوں کے درمیان حکومت کرنا انصاف کے ساتھ)

خیز کہ بنائمت مملکت تازہ کہ ✣ چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام

بالآخر آدم نے سپر ڈال دی اور کر لیا جو مار سیاہ زلف کہا تھا، وہ دھم سے زمین پر گر گیا، مگر یہ زمین اس کو اجنبی سی معلوم پڑی۔ وہ ڈر گیا۔ بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ یہ زمین اسے دشمنوں کی بستی معلوم ہوئی:

اشجار سنبھالے ہیں بھالے
پھولوں میں چھپے ہوئے ہیں کالے
سایوں میں نہنگ منہ پسارے
کیا دل پہ چلا رہے ہیں آرے
تلوار ہلال کھینچتا ہے
تارے بھی نیزے مارتے ہیں

آدم کو اب اس کا احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی۔ جنت کھو کر دوزخ حاصل کی ہے، وہ اُداس ہے، نادم ہے، اب وہ اس کھوئی ہوئی جنت میں کس طرح واپس جا سکے گا، وہ جنّت جہاں:

خدشہ تھا نہ کوئی جستجو تھی
دھڑکا تھا نہ کوئی آرزو تھی
آرام تھا دل کو، تن کو آرام
اوّل آرام، آخر آرام

اپنا غصّہ مار سیاہ زلف پر اُتارنا چاہتا ہے اور آدم اپنی نفرت کا یوں اظہار کرتا ہے:

تیری یہ زباں اگر نہ ڈستی
میری جنّت کبھی نہ چھٹتی

اقبال نے زمین پر آکر آدم کو خوش خوش دکھلایا ہے، روح ارضی بھی آدم کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کرتی ہے: ؎

ہمہ سوز ناتمام، ہمہ درد آرزویم ؛ بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجویم

مگر کلیم صاحب نے آدم کو زمین پر خوش نہیں بلکہ اُداس اور ملول دکھلایا ہے۔ اس دنیائے آب و گِل میں شروع شروع وہ اپنے کو سازگار نہ بنا سکا۔

ہاں شاد رہے یہ دل کہ ناشاد
جینے سے فراغ اب کہاں ہے؟

یہ ذوق کا ہلکا پرتو ہے اور بیدل کے انداز کا شعر ہے۔

آدم کی گریہ وزاری کا مار سیاہ زلف پر کچھ اثر نہ ہوا، اس کو اپنے کیے ہوئے پر ندامت نہیں آئی، اس کو ایقان ہے، جو اس نے کہا ہے، وہ آدم کی طبیعت کے موافق بن کے رہے گا، کہ اس کی فطرت مرکب کا یہی تقاضہ تھا، وہ کہتا ہے:

جینا ہے تو زندگی سنوارو
اپنی جرأت کو آزماؤ

تم گھبراتے کیوں ہو، ساری خدائی تمہارے قدموں پر لوٹیگی، اک ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے، یہ طوفان، یہ بجلی، یہ صحرا یہ دشت وجبل تمہارے ہیں انھیں اپنے قابو میں کر لو اور جنّت جنّت نہ پھر پکارو۔

اس زمین پر کیا نہیں ہے، جو وہاں جنت میں تھا۔ یہاں جو ہے تمہارے لئے ہے اور وہاں جو تھا وہ تمہارا نہ تھا، یہ تو حیات کی پہلی منزل ہے اور اس میں تم دل گرفتہ ہو گئے، ابھی تو کتنی دنیائیں پردوں سے جھانک رہی ہیں ان کو برافگندہ نقاب کرو، اٹھو، نئی منزلوں کو دیکھو، ان منزلوں کی رنگا رنگی کو دیکھو، یہاں تو مختلف رنگوں کا بسیرا ہے، کبھی اجالا ہے اور کبھی اندھیرا، اجالے میں بڑھتے رہو، مگر اندھیرے سے گھبرا نہ جاؤ ـــــ اللہ نے تمہیں عقل دی ہے، فہم دی ہے، سوچو، سوچو کہ آخر یہ وسیع و عریض دنیا وجود میں کیوں آئی۔ یہ کیسے بنی، کس نے بنائی، اگر یہ سراسر فریب کا مسکن ہے، تکلیفوں کی بستی ہے، آنسوؤں کا نشیمن ہے، ظلمت کا مامن ہے، تو پھر آخر یہ بنی کیوں؟ اے آدم تم فکر نہ کرو، ہوش سے کام لو اور عمل کے جادو سے اس دنیا کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو کہ یہی فکر و عمل اسم اعظم ہے۔ جس سے سارے رازہائے سربستہ منکشف ہو جائیں گے اور تم کو اپنی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ جب تم اپنے آپ کو پہچان لوگے، تو پھر ساری کائنات کو جان لوگے اور ساری کائنات کے خالق کو جان لوگے۔ انسان کی برابر یہی سعی ہونی چاہیئے کہ وہ رازِ درونِ حیات کا محرم بن جائے، اس ذات کا احاطہ کرے، ما عرفناک حق معرفتک

زبان پر نہ لائے۔ (یہ خیال راسخ کے خیال سے بلند ہے)۔

ادراک نہیں ہے عجز ادراک
سوچو تو یہ قول ماعرفناکﷺ

(میں نے تجھ کو جتنا جاننے کا حق تھا نہ جانا)

دنیا تو متضاد میلانات کا سرچشمہ ہے، زندگی موت کا زیور بن کر آئی ہے اس لئے موت سے گھبرانا بیکار ہے۔ اگر موت نہ ہو، تو زندگی سونی سونی ہو جائیگی' فنا کا احساس' بقا کے احساس کا ضامن ہے۔ یہ انقلاب' یہ تغیر، یہ گردش۔ سب کی سب زینت حیات ہیں'۔۔۔ فنا کے احساس ہی سے دردمندی آتی ہے اور دردمند دل راز دار کائنات ہو کے رہتا ہے۔ دردمند دل کے لئے خودی کی بیداری ضروری ہے' یہی خودی اس کو نجات کی طرف لے جاسکتی ہے۔ (شاید اقبال نے اسی لئے خودی کی نگہداری کی تلقین کی ہے) جب آدم کی خودی تکمیل حاصل کرے گی' تو وہ سرِ آدم یزداں کو بتانے کا اہل ہوگا، یزداں کیا ہے یہی انسان کمل' یہی مرد کامل، آدم کی طرح خدا بھی تو ترقی کے مدارج طے کرتا رہا ہے' وہ ہماری آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ ہماری روح میں سمایا ہوا ہے' وہ کہاں ہے ہم ہیں۔ ہم کہاں ہیں وہ ہے' یہی راز فنا ہے اور یہی راز بقا'

وہ آنکھ سے میری دیکھتا ہے
وہ دل میں مرے تڑپ رہا ہے
وہ مری روح میں سما کر
لو! اپنی خودی کو ڈھونڈتا ہے
مر مر کے وہ میرے جسم و جاں میں

اظہارِ حقیقت

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جن نامساعد حالات کے تحت ۲۵ نظمیں ایک نظریہ ایک تجربہ، اشاعت پذیر نہ ہو سکی تھی، ان پر جلد ہی قابو پانے کی راہ نکل آئی اور اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کے دوسرے شعری مجموعہ پر تبصرہ ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر نظم کی روح تک پہنچ پاؤں۔ لیکن میں راہ میں بھٹک گیا ہوں یا منزلِ مقصود تک پہنچ پایا ہوں اس کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔

اسٹیونسن (stevenson) نے اپنے مقالات میں ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ اس نے ابتدا میں بعض ممتاز انشا پردازوں کی نقل اُتارنے کی کوشش کی، ہم اور آپ جانتے ہیں کہ رفتہ رفتہ انھی مختلف اسالیب بیان سے اس نے اپنا ایک اسلوب بنا لیا۔ خود بہار میں جناب شاد عظیم آبادی کی ذات کو لیجئے۔ انھوں نے دہلوی انداز کی اتباع کے ساتھ ساتھ لکھنوی رنگ کی بھی پیروی کی اور ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے اپنا ایک الگ رنگ اور آہنگ پیدا کیا اور آج اسی رنگ کی بدولت وہ جدید تغزل کے امام کہے جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد یوں تو انگریزی، اردو، فرانسیسی فارسی اور عربی کے بہت سارے شعراء و ادبا سے براہ راست متاثر ہوئے اور ان متضاد و متباین رنگوں سے ایک رنگ نکھالنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر ہارڈی کی طنز سے اس مجموعہ میں وہ زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اسی اثر نے ان سے بعض ایسی طنزیہ نظمیں کہلوائی ہیں کہ ہر مصرع سے حیات پر طنز جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی انداز نے ان کے مقصد اور ان کے پیغام کو حسن اور شوخی کے بیان میں اور انسان کی مجبوریوں کو اس کے اختیار کے روپ میں پیش کر کے ہمارے لئے بہت سارے امکانات پیدا

اللہ! امر بنا ہوا ہے
اسی طرح اے آدم، مر مر کے تم بھی امر بن سکتے ہو اور یہی تمھاری داستان کی تکمیل ہو گی۔

اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرّہ نہیں شاید، سمٹا ہوا صحرا ہے

---

(۶)۔ ۲۰۸ مصرعوں کی یہ نظم ڈرامیٹک مونو لوگ کی ایک انوکھی مثال ہے۔ اس میں عورت کی نفسیات اور جنسی حسّیات کا ایک انداز دکھلایا گیا ہے۔ اس کا قصہ تو ایسا ہے کہ اُردو داں طبقہ اس طرح کے تجربے کو اخلاق عالیہ کے منافی سمجھے تو غلط نہ ہو گا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس طرح کے تجربات اسی دنیا میں ہوتے رہے ہیں۔ اس نظم میں عورت اپنی خلقی کمزوری کے ساتھ سامنے آتی ہے، اس کی خلقی کمزوری اُس کی محبّت ہے اور محبّت اندھی ہوتی ہے، اس میں تمیز خیر و شر کی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ میری مراد جنسی محبّت سے ہے، سفلی محبّت سے ہے۔ عورت کی دوسری صنفی کمزوری ہے انتقام اگر وہ اپنی محبت کے جذبے کو ٹھکرائے جاتے ہوئے دیکھتی ہے، تو اسے یہ ناقدری برداشت نہیں ہوتی اور وہ انتقام پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ حضرت زلیخاؓ کے ساتھ یہی ہوا۔ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو تنہائی میں بلایا اور کہا هيت لك (آجاؤ میرے پاس) مگر یوسف بھاگ گئے، اپنی محبت کی اس طرح رسوائی دیکھ کر زلیخا انتقام لینے پر اُتر آئیں اور یوسف کو برسوں قید میں ڈلوا دیا، یہاں وہ عورت اپنے جذبات کی بے حرمتی سے تلملا کر اس مرد کو قتل ہی

کر ڈالتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ یوسفؑ زندہ رہے، تو بعد میں زلیخاؑ ان کو مل گئیں۔ مگر وہ جوان اگر زندہ رہتا تو یہ عورت اسے عمر بھر نہیں مل سکتی اس داستان قتل کو مختصر لفظوں میں سنیئے۔ ایک عورت اپنے سوتیلے بچے کو مدت دراز کے بعد دیکھتی ہے، وہ اس کے حسن و جمال، شباب اور دلکشی سے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے جنسی اتصال کی خواہش کر بیٹھی۔ اس جوان ارغنا نے اس خیال کی پذیرائی نہ کی اور وہ بھاگ نکلا۔ عورت محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبوں سے اس کے اس عمل پر نظر ڈالتی ہے۔ بالآخر وہ اپنی رسوائی کو پی نہ سکی اور اس نے اس کا خون کر دیا، خون کرنے کے بعد خون کا احساس اس کو ایک حد تک پاگل بنا دیتا ہے اور ہر جگہ اس کو خون ہی خون نظر آنے لگتا ہے:

خون ہے دل میں مرے، خوں ہے آنکھوں میں مری
بہتے دریا بھی ہیں سرخ، اڑتے ہوئے ابر بھی سرخ
آسماں سرخ، زمیں سرخ، ستارے بھی ہیں سرخ
خون کی سیل بپھرتی ہے، جدھر دیکھتی ہوں

ایسی محبت اور جنسی خواہش کا ذکر یونانی ادب میں ہے۔ euro-pidies یوروپڈیز میں اس طرح کی محبت ایک ماں کی اپنے سوتیلے بیٹے سے جنسی محبت کو بیان کیا گیا ہے۔ فرانسیسی ادب میں اس کی کمی نہیں۔ راسین Racine نے فیڈرا Phedre میں بھی اس طرح کی جنسی تحریکات کا ذکر کیا ہے۔ امراؤ القیس کی بابت بھی یہ مشہور ہے کہ اس کو اپنی سوتیلی ماں سے جنسی تعلق تھا۔ شاید اسی واقعہ کی طرف مندرجہ ذیل اشعار میں کچھ

اشارات ملتے ہیں:

فبتُّ اکابد لیل التمام — والقلب من خشیۃ مقشعر
فلما دنوت تسددتہا — فثوبا نسیت وثوبا اجر
ولم یرنا کالیءُ کاشح — ولم یفش منا لدی البیت سر
وقد رابنی قولہا یا ھناہ — ویحک الحقت شرا بشر

یہ جنسی خواہش تو حیوانی خواہش ہی کہی جاتی ہے۔ اگر انسان کا آدم متمدن نہیں ہوا ہے، تو وہ اس طرح کی جنسی تسکین سے گریز نہیں کرتا ہے مگر یہ جذبہ ہے ایسا مذموم، مردود، کہ ہر مذہب نے اور ہر قوم نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، مگر بعض ایسے شقی ازل بھی ہوئے ہیں جو اس ناجائز جنسی اتصال سے پرہیز نہ کر سکے، یہ جذبہ اور یہ تجربہ سماج کی پیشانی پر کوڑھ کا داغ ہے مگر سماج کی پیشانیاں ایسے داغ رکھتی آئی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اردو ادب میں اس طرح کا خیال پہلے پہل اسی نظم میں پیش ہوا ہے اور ہماری تہذیب میں جنسی عصمت اور انسانی عظمت کا جو احساس راسخ ہے اس کے پیش نظر ایسے خیالات معصوم دماغوں کے لیے گمراہ کن ثابت ہو سکتے ہیں، مگر یہ بھی سوچئے کہ اس قصہ سے عبرت اور نصیحت بھی تو مل جاتی ہے،

کلیم صاحب نے خود حالی کے مسدس پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ہر مضمون کو شعر میں منتقل کرنا مستحسن نہیں۔ اس نظم کا بھی مضمون کچھ اس طرح کا ہے کہ اس کو نثر میں بھی لکھا جا سکتا ہے، مگر نہیں حالی نے نثر سے نظم کے قالب میں خیالات کو منتقل تو کیا لیکن اس میں شعری خوبیاں پیدا نہ کر سکے، وہ تو نثر بھی نہ رہی اور نظم بھی نہ رہی، لیکن یہاں ان خیالات کی اہمیت

صفر ہی کیوں نہ ہو، ان کو بیان کرنے میں شاعرانہ صنّاعی کا خوب خوب مظاہرہ ہوا ہے۔ پوری نظم شاعری کی ساری خوبیوں پر حاوی ہے، الفاظ کا برمحل استعمال خیالات کی برجستگی، زبان کی شستگی، محاوروں کا صحیح مصرف اور ہر لفظ ارتقائے خیال کی طرف رہبری کرنے والا ہے، استعارے ہیں تو نئے اور شاداب، بیان میں موج کی روانی اور خیال میں ایک ہیجانی کیفیت ہے دیکھئے۔ عورت کسطرح متعاند رجحانات اور محبت و نفرت کے ملے جلے جذبے کا اظہار کر رہی ہے کس طرح بے ساختہ ساری باتیں زبان پر آرہی ہیں۔ ایک طرف تو انتقام کی تیاری ہے، اپنے شوہر سے شکایت کی تیاری ہے، دوسری طرف آنکھوں آنکھوں میں وصل کی دعوت ہے۔ یہی ہے عورت کی فطرت چالاک:۔

دیکھو سمجھاتی ہوں تم کو مرا کہنا مانو
آج کی رات مری جان سنو، آج کی رات

دونوں تبسم ایسے ملیں جیسے دو ئی تھی ہی نہیں

اور پھر سنبھلتی ہے:

ہائے کمبخت ٹھہر، دیکھ کہاں جاتا ہے
مجھ سے بھاگے گا کہاں، وہ نہ رکا، پر نہ رکا

آنے دو تو انھیں، میں اس کو چکھاتی ہوں مزہ

کلیم صاحب کا یہ خیال ہے کہ شاعر کی عظمت اس کے تنوع تجربات میں ہے ممکن ہے یہ سارے تجربات اس کے اپنے نہ ہوں۔ ایلیٹ کا یہ قول ہے کہ شاعری

شخصیت کا اظہار نہیں، بلکہ شخصیت کے اظہار سے فرار کی راہ ہے۔ یہاں اس طرح کی شاعری کا کامل نمونہ پیش نظر ہے۔ انواع و اقسام کے خیالات شاعر کے لئے خام مواد کا کام کرتے ہیں۔ اب یہ اس آرٹسٹ کی اپنی صلاحیت پہ ہے کہ ان خام مواد سے وہ کیسا کام لیتا ہے۔

اس نظم کا وہ بند جو اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

'میں ہوں دیوانی تو دیوانہ بنایا کس نے!

غالب کے ان دو اشعار کی تفصیل ہے، جن کا بیان خود اس بند میں ہے مومن کا ایک شعر صرف ایک لفظ کی تحریف کے ساتھ اس نظم کی ایک اکائی بن گیا ہے۔

---

(۷) اس نظم میں نظم کہنے کا سلیقہ بتایا گیا ہے، کس طرح ایک خیال دوسرے خیال کو مہمیز کرتا ہوا، بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ شاعر کا ذہن کن کن امور کی طرف جاتا ہے اور کس کس تجربہ سے کام لیتا ہے۔ اس کا تحسین بیان ہے، کس طرح ایک نقطہ کو اس کا متخیلہ ایک دائرہ میں تبدیل کرتا ہے اس کا شعور دیا گیا ہے۔ کس طرح بات سے بات پیدا ہوتی ہے اور تحت شعور و لاشعور میں جتنے خزانے احساسات کے پنہاں رہتے ہیں ان کو رفتہ رفتہ سامنے لانا شاعر کا کمال بن جاتا ہے، کس طرح اس کو درد و غم جمع کرنے پڑتے ہیں اور اس تریاقِ محبت سے انسانیت کا علاج ہو جاتا ہے۔ یہ ہے شاعری کا مقصد، اس نظم کا مرکزی خیال ہے:

'کہتے ہیں وہ کہ آپ بھی کتنے حسین ہیں'

ابتدائی بند میں نظیر اور انیس کے مصرعے بیساختہ آ گئے ہیں۔ مخاطب یہ سمجھتا ہے کہ اب تو وہ بوڑھا ہو گیا ہے، اب اس میں نہ تو حسن رہا اور نہ رعنائی مگر اس کا محبوب اس کو حسین کہتا ہے۔ کہنے والا خود حسین ہے، نازنین ہے، ورنہ وہ اور حسن، یہ تو خیال موہوم ہے۔ سفرِ حیات نے چہرہ پر غبار کا غازہ مل دیا ہے، ضعیفی نے سارے آثارِ شباب کو مسخ کر دیا ہے اس بوڑھاپے میں یہ کہنا کہ آپ بھی کتنے حسین ہیں، ایک عجیب سی بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف الفاظ کی بناکاری ہے، یہ الفاظ کا حسن ہے اور الفاظ کا جادو، ورنہ وہ اور حسن، حسن اب کہاں، اب تو سر پہ پیری سوار ہو گئی ہے، بال چاندی کی طرح اُجلے، کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے ہیں، جوانی کے گھٹیلے چہرے پر اب جھُرّیوں نے اپنا جال پھیلا دیا ہے۔ جسم کی رگ رگ کمزور ہو کر، کمزور رجال کے حلقوں کی طرح ٹوٹ رہی ہے۔ آنکھوں سے روشنی غائب، دل سے خوشی محو، بوڑھا اور لڑکا برابر ہوتا ہے۔ اب تو اس کی اپنی خودی بھی رخصت ہو چکی ہے، اب تو زندگی بجھی بجھی سی لو دے رہی ہے:

دل بھی نحیف جان بھی زار و نحیف ہے
جو ولولہ تھا اب وہی ضعف ضعیف ہے

جاں میں وہ روگ ہے کہ خدا بھی خموش ہے
تاریک شب ہے، صبح اجل بھی قریب ہے

آپ نے دیکھا ایک معمولی سا خیال کس طرح بڑھ رہا ہے، کس طرح کثرت کی شکل لے رہا ہے، اب اس کے دماغ میں پرانے خیالات جاگ

جاتے ہیں۔ اور وہ تین تصویریں پیش کرتا ہے، اس کی آنکھیں بند تو ہیں، مگر دل کی آنکھیں اب کھل گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلمی ریل کی طرح پردۂ سیمیں پر مختلف خیالات رقص کرنے لگے، وہ حال سے ماضی کی طرف لوٹتا ہے اور سارے خیالات کا ایک جال سا بچھ جاتا ہے۔ ایک ہی خیال ہے جو پھیل کر ایک دنیائے محبت بنا رہا ہے۔ پہلی تصویر یہ ہے کہ اس کی محبوبہ اُبھرے ہوئے بدن کے ساتھ، مہربان آنکھوں سے دیکھتی ہوئی، مہربان دل سے التفات پہ مائل اپنی کالی کالی زلفوں کے لٹ چھٹکائے گل ماہتاب کی طرح چمکتا ہوا چہرہ لئے ہوئے موسیقی میں محو سامنے آتی ہے،

ہاتھوں میں گیت، آنکھوں میں گیت اور لبوں پہ گیت
دل میں اُبلتا، جاں میں مچلتا ہے رقص زیست

آئی اور بڑے ناز سے آئی، گرم سخن رہی اور اس کی نغمہ پرور آواز نے دل کے تار جھنجھنا دیئے۔ اس کا دل بھی تو جوان تھا، مچلا مگر مچل کے رہ گیا ــــ آئے بھی وہ، گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔

ان کو ادھر حجاب، ادھر زعم اتقا
ہونٹوں سے ہونٹ ملنے نہ پائے چلے گئے

اب یہ تشنہ جذبہ اور نامکمل کہانی آگے بڑھتی ہے۔ محرومی کی پہلی منزل ختم ہوئی، اب اس پردۂ سیمیں پر دوسری تصویر اُبھرتی ہے، وہ ایک سچا اور پکا شاعر بن چکا ہے۔ اس کے شعر، اس کی غزل، اس کی محبت کی رازداں بن گئی ہے۔ وہ محبوبہ اس کے اشعار پڑھتی ہے، گاتی ہے، وہ تو خود بھی سراپا غزل ہے، بلکہ رشک غزل ہے۔ ان شعروں کے طفیل، محبت کے ان

تحفوں کی پذیرائی میں وہ مائل بہ کرم ہو گئی، اس کا حجاب ٹوٹا، جو ان کا حجاب ہی کیا۔ یہ تو حباب کی طرح ہوتا ہے۔ ذرا سے ارتعاش پر ہیوٹ بہتا ہے اس کا حجاب ٹوٹا۔ اس لئے کہ وہ اس کے زعم اتقا کے معنی معکوس سمجھ گئی:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

لیکن بُرا ہو شرم کا، زعم اتقا تو پاش پاش ہو چکا تھا۔ اب شرم دامنگیر ہو گئی:

ہونٹوں سے ہونٹ آئے، ملے اور چلے گئے
دل میں مرے وہ بیٹھے کوئی دم چلے گئے

ان دو مسلسل ناکامیوں کے بعد آخری تصویر کامرانی کی سامنے آتی ہے رفتہ رفتہ اس کی محبوبہ کسی انجانے اثر کے تحت اس کے قریب ہوتی جا رہی ہے پردۂ سیمیں پر تیسری تصویر ناچتی ہے۔ وہ شوخ و شنگ محبوبہ، جس میں ہرن کی سی پھرتی آ گئی ہے۔ جس کی آنکھیں چشم غزال کو شرما دیں، ایک مستانہ ادا سے، ہوشربا انداز سے، سامنے آتی ہے اور موسیقی کے جوہر دکھاتی ہے۔ موسیقی کے شعلے اس کے دل و جان سے لپٹ جاتے ہیں، اس کے نغمہ نے ساری کائنات کو مسحور کر دیا ہے، جن و انس، وحوش و طیور سب پر ایک طرح کا سرور چھا جاتا ہے اور کون و مکاں وجد و رقص میں آ جاتے ہیں۔ سب ایسے ہیں، اس بدمستی میں، اس مدہوشی میں، اس کی شرم گئی، اس کا حجاب رخصت ہوا۔ اس نے اس کے ہاتھ اپنے ریشمی ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی نظر میں ایک ساتھ جانے کتنے چاند تارے چمک گئے۔ شاعر کو وہ ساری باتیں یاد آ رہی ہیں، جو پہلی بار اس کی محبوبہ نے کہی تھیں:

اللہ کیا ذہین ہیں کیسے فطین ہیں
یہ عمر اور علم کے حصن حصین ہیں
سنجیدگی کا باب ہیں، حبل المتین ہیں

(ان ٹکڑوں پر پھر انیس کا رنگ ہے)

وہ محبوبہ اپنی دسترس کے مطابق اور اپنے نظریہ حسن کے مطابق، اس کے حسن کو بیان کرتی ہے:

یہ ہاتھ آپ کے ہیں کہ ہے شاخ صندلیں
پتلی سی یہ کلائی کہ ہے برگ مرمریں
یہ انگلیاں ہیں جیسے نزاکت کی پتلیاں
جنبش ہے کیا لطیف کہ جیسے چلے زباں

اب صنف نازک کی نزاکت اپنی کمزوری دکھانے پر مجبور ہو رہی ہے ہاتھ سے ہاتھ جو ملے، تو بجلی کا ایک کرنٹ ایک سے دوسرے دل کو لگتا ہے، جوانی اور جوانی کی برنائی، حسن اور حسن کی شوخی، اور عشق اور عشق کی گرمی ان تینوں نے مل کر خرمن دل میں آگ لگا دی۔ اس کی رگ رگ کھنچنے لگی، خود بخود اس کے ہونٹ کانپ گئے اور محویت و لذت کی ایک بجلی سی دل میں اتر گئی:

ہونٹوں پہ ہونٹ آئے کہ بجلی چمک گئی
ہونٹوں سے پھر جو دل میں وہ بجلی اتر گئی
دھڑکن بڑھی وہ دل کی ستاروں سے جا ملی
ایسی رگوں میں آتش سیال بہہ گئی

دل بھی جلا ، جگر بھی جلا ، جاں بھی جل گئی

اور جو ہونا تھا ہوا

تقویٰ مرا نہ شرم ہی ان کی بنی رہی
خلوت میں آج دونوں کو آسودگی ملی

اب خیالات کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ سارے کے سارے سپنے اس کی آنکھوں کے تارے بن کر ادھر اُدھر بکھر گئے اور وہ چلتی پھرتی صورتیں یکبارگی پگھل گئیں، اب اس کی آنکھوں میں وہی تاریکی ہے، دل میں وہی مایوسی ہے اور جاں میں وہی بیقراری ہے ـــــ اس احساس کے ساتھ وہ اپنے حال کی طرف عود کر آتا ہے، اس کا حال تو ایسا ہے جو بد آمال ہے اور بد مآل بھی شاہد۔ پھر اس کو ضعیفی، بے کسی اور اپنے حال سے بیزاری ستانے لگتی ہے اور دیوانگی کے اس عالم میں، احباب کی منافقت، پیری کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ میر کی روح سے مدد مانگتا ہے:

حالت تو یہ ہے کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ
دشمن ہیں دوست، دوست ہیں دشمن بنے ہوئے
اپنے پرائے خنجر کیں ہیں لئے ہوئے
خنجر کھلے کھلے ہیں، تو نشتر چھپے چھپے

اپنے موجودہ حال کا ذکر پھیلا کر اس لئے کیا ہے کہ اب اسے حقیقت

کر دیئے ہیں۔

ہیئت کے لحاظ سے بھی کلیم الدین احمد پر مغربی شعراء کا گہرا اثر پڑا ہے۔ لیکن انجانے طور پر معتدبہ تعداد میں ایسے اشعار بھی نوک قلم سے نکل آئے ہیں، جو مشرقی ہیئت کے دعویدار ہیں۔ بالفہم زبان پر مقامی اثر ہے۔ اسی مقامی اثر نے آزاد ہوتے ہوئے بھی ان کو بہار کے آب و گل کا اسیر رکھ چھوڑا ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ سخنہائے گفتنی میں طنز و ظرافت پر بحث کرتے ہوئے بہار کے آب و گل کو بھول گئے۔ یہ ہے تضاد مگر یہ تضاد تو زندگی کی ضرورت ہے اور ادب اسی سے توانائی حاصل کرتا ہے۔

جو تجربے کلیم الدین احمد نے اُردو شاعری میں کئے، وہ سارے تجربات کہاں تک سازگار ہو سکیں گے۔ یہ تو آنے والی نسل جان سکے گی۔ ابھی تو ہم یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ان مغربی شعراء کا تجربہ ہمارے مزاج کے خلاف ہے۔ کاش ہمارے نقاد یہ سمجھ جاتے کہ یہ تجربات ہماری زندگی کے موافق ہیں، مخالف نہیں۔ حیات من حیث حیات وسیع ہے، کائناتی ہے اور اس حد تک ہر ادب کو وسیع اور کائناتی ہونا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کائناتی تجربوں میں معنی ہونا چاہیئے کہ یہی معنی زندگی اور پائیداری کی ضمانت کرے گا۔

آخر میں ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے دونوں کتابوں کی اشاعت میں میری ہمت افزائی کی ہے۔ خصوصاً ایک ایسے مخلص دوست کا شکر گذار ہوں، جن کی کوششوں سے طبع ہو کر یہ حقیر تصنیف آپ کے سامنے ہے۔

صدرالدین

۲ر اکتوبر ۱۹۶۷ء

کا احساس اور بھی تند و تیز ہو رہا ہے، اب تو اس کی زندگی ہی محال ہے اور موت ہی اس کی مجبوریوں پر پردہ ڈال سکتی ہے، اب محبت کی ترنگ اور جوانی کی امنگ، اک خواب ہے خواب!

کس کو سناؤں، کون سنے حال سوزِ دل
نغمے خموش، ٹوٹے پڑے ہیں یہ سازِ دل

نہ وقتِ پیری، شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اس عالم یاس میں، اس عالم تنہائی میں، اس عالم بے نوائی میں اگر سہارا ہے تو اپنے زورِ قلم کا وہ اب شاعری کرے گا اور اس طرح اپنے محبوب کی یاد تازہ کرتا رہے گا، اس لئے کہ:

کہتے ہیں وہ کہ آپ کی پیاری زبان ہے

اب آپ دیکھئے کس طرح ایک خیال اتنے سارے خیالات کھینچ لایا ایک کڑی سے دوسری کڑی ملتی گئی، اور ایک بات ایک فسانہ بن کر درد دل کا سہارا بن گئی اور ایک معمولی سا خیال ۴۵ مصرعوں پر حاوی ہو کر ایک مکمل نظم ہو گئی۔ ابو نواس کی بابت مشہور ہے کہ ایک بار خلیفہ ہارون الرشید نے اسے ایک مصرع دیا اور کہا کہ اس پر مصرع لگاؤ، وہ مصرع یہ تھا ——

کلام اللیل یمحوہ النہار (رات کی بات دن ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے)

اس ایک خیال نے ابو نواس کے دماغ میں اتنے سارے نقوش بکھیر دیئے کہ وہ رات کی داستان کو نظم کر کے خلیفہ کے سامنے گیا، خلیفہ نے سنا، بات سچی تھی، حکم ہوا اس کی گردن مار دی جائے، وہ بیچارہ بڑا ہی پریشان ہوا، اس نے کہا

حضور میں آپ کے ساتھ اس رات کو چوری چھپے شریک نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے مصرعے نے، اسی ایک خیال نے اتنے سارے خیالات کی عمارت کھڑی کر دی۔ یہاں بھی بس ایک مصرع ہے، جس پر مصرعے لگائے گئے ہیں۔ گویا یہ طرحی غزل ہے، ہمارے یہاں مشاعروں میں طرحیں دی جاتی ہیں۔ مگر شعرائے کرام دماہی کے بیل کی طرح گھوم پھر کر ایک ہی نقطہ پہ آجاتے ہیں ـــ یہ نظم ایک نمونہ ہے کہ اس طرح اگر طرحی مشاعرہ ہو تو اس سے ادب اور حیات دونوں مستفید ہو سکیں۔

---

(۸) اس نظم میں تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں موجودہ زندگی سے ناآسودگی ملتی ہے، دوسرے میں اس دنیا کا نقشہ ملتا ہے، جہاں آسودگی حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے اور تیسرے میں اس آسودگی اور طمانیت قلب کا اظہار ہے جو اس دنیا میں میسّر ہو گی۔ پہلا اور تیسرا حصہ چھوٹی بحر میں ہے جس سے کاروانِ حیات کی تیز رفتاری اور مسرت و کامرانی کی رواروی کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے دوسرا حصّہ قدرے طویل بحر میں ہے جس سے اس عالم سرور و انبساط کے ٹھہراؤ اور اس کی رنگینیوں کا سنبھل سنبھل کر مشاہدہ کرانا مقصود ہے۔ حال سے بیزاری اور اس خراب آباد سے کسی اور بستی میں جا کر رہ پڑنے کی خواہش کا اظہار دوسرے شعراء بھی کرتے ہیں۔ غالب نے ایک غزل لکھ کر اس جذبہ کی تسکین چاہی۔ وہ تنہا، بے در و دیوار سا اک گھر، بے یار و مددگار سا ایک مقام کی تلاش میں رہے اس لئے کہ ان کا سماج ان کے لئے اجنبی تھا۔ ان کی مجبوری ناقابل برداشت، ان کی محکومی قابل لعنت تھی، دستور زباں بندی نے استعارے کی زبان سے جلے دل کے پھپھولے توڑ لئے، یہ نفاق و عناد کی دنیا، یہ غلامی و قید و بند کی بستی،

یہ دوستی کا مدفن، دشمنی کا مخزن غالب کے لائق نہ تھا، اقبال کی زبان بھی پابند رسم کہن تھی، انھوں نے بھی اپنی کہانی گل کی زبانی بتادی،

مگر غالب اور اقبال دونوں ہی سرگشتہ خمار رسوم و قیود رہ گئے۔ اس نادر خیال کو ابدی و آفاقی نہ بنا سکے، کوئی تعمیری صورت پیش نہ کر سکے اور شاید وہ کرنا بھی چاہتے تو کر نہیں سکتے تھے، غالب کا لہجہ غمگین اور آواز محزوں ہے اقبال کا لہجہ تیز ضرور ہے، مگر اس کا انداز بیگانہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس نظم میں چونکہ محدودیت شاعر پسند نہیں کرتا ہے۔ اس لئے وسعت ہی وسعت ہے، گرچہ جو تجربات حیات عام ہیں اور عمومی ہیں ان کا ذکر تو ناگزیر تھا۔

مرنا بھی مشکل، جینا بھی مشکل
کیسی کٹھن ہے، یہ دل کی منزل
اک سعی پیہم، اِک فکر پیہم
اٹھتا ہے ہر دم شورِ دمادم

حال سے نا آسودگی یہاں بھی ہے، لیکن یہ نا آسودگی چند تجربات کی بنا پر آئی ہے۔ روایتی یا تاثراتی نا آسودگی نہیں ہے، اسی لئے شاعر کہتا ہے:

دنیا کو چھوڑ دو یہ بزم غم ہے
سوز جگر ہے، شمع الم ہے

یہ تو ایک حقیقت کا بیان ہے، آج کی دنیا محفل عیش و طرب ہوتے ہوئے بھی بزم غم ہی بن گئی ہے:

لب پر تبسّم، دل میں عداوت
ظاہر میں الفت، باطن میں نفرت

ہر بول نفرت، ہر چال نفرت
تو سانس لینی بھی ہے اذیت

اس غمکدہ میں، اس مجبور دنیا میں تو سانس لینا بھی دشوار ہے۔ اس لئے اس دنیائے دنی کو تیاگ دینا چاہیئے، صانع قدرت نے جس چہرے کو اپنے ہاتھوں سے بنایا یہاں تو وہی مسخ ہوا جا رہا ہے۔ خالق و مخلوق کے رشتے روز بہ روز اُلجھتے ہی جا رہے ہیں۔ وہ انسان جو اس ذات سرمدی کا آئینہ تھا، اب اپنی جلا و صفا کھو بیٹھا ہے، اب نہ تو خدا کو جاننے والے رہے اور نہ کوئی اس کی طرف رہبری کرنے والا رہا۔

اُلجھی ہے کس کی یہ زلف پُرخم
شانہ شکستہ، آئینہ برہم

یہ کیسی دنیا ہو، جہاں چل کر بسیرا کرنا چاہیئے، اس کا نقشہ بھی واضح الفاظ میں کھینچا گیا ہے، غالب نے تنہائی محض چاہی تھی، جہاں ان کے سایہ کے سوا اور کوئی نہ ہو، مگر یہاں شاعر اپنا ساتھی بھی چاہتا ہے۔ جس کو وہ اس دنیا کی بوقلمونیوں کو دکھلا سکے، یہ مقام وہ ہو جہاں جنت کی بہاریں دعوت نظارہ دیں، جہاں فطرت اپنی ساری گلکاریوں، رعنائیوں اور فیاضیوں کے ساتھ جلوہ آرا ہو۔ ہر شئی سے اطمینان و مسرت مترشح ہو۔ پتھر بھی نغموں کی حرارت سے پگھل پگھل کر آبشار بن رہے ہوں۔ جہاں ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے دلوں میں گدگدی پیدا کرتے رہیں۔ بس ایسی جگہ شاعر ہو اور اس کا جیون ساتھی۔

آؤ خوشی کے نغمے بہائیں
تم گیت گاؤ، ہم گیت گائیں

ڈبلیو۔ بی۔ ایٹس W. B. Yeats کی بھی ایک نظم ہے۔ دی لیک آئل آف انزفری The Lakeisle of Innisfree جس میں اس نے ایک ایسے ہی جزیرہ میں جاکر بس جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ بھی تنہائی محض کا طالب ہے۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ کیوں اس جزیرہ میں بسنا پسند کرتا ہے، اس کو یہاں کیا انکلیمنٹ ہے، یہ اس نے قارئین کے بالیدہ شعور پر چھوڑ دیا ہے، ایٹس آئرلینڈ کا رہنے والا تھا اور یہاں کے لوگ سیاسی مجبوریوں کے تحت بالطبع قنوطیت پسند تھے۔ اس لئے اس نے بھی اپنے ماحول سے ایک طرح کی بیزاری کا اعلان کیا تھا، وہ جزیرہ کیسا ہوگا، اس کا دائرہ اور کوئی طویل بیان یہاں نہیں، وہ کہتا ہے کہ اس کو سکون چاہیئے اور سکون وہاں بارشِ رحمت بن کر دھیرے دھیرے آتا رہتا ہے۔

There midnight's all a glimmer and noon a purple glow,
And evening full of the linnets' wings.

یہ نظم ایٹس کی سراسر ذاتی اور شخصی ہے۔ جس میں اس کا اندرون چنگاری کی میں سلگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لارڈ ٹینی سن Lord Tennyson کی نظم لوٹس ایٹرس Lotus Eaters اس قبیل کی نظموں میں طویل بھی ہے اور مختلف رنگوں کی حامل بھی، کلیم صاحب اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں، یوں کہیئے کہ اردو میں انھوں نے ایک لوٹس ایٹرس لکھ دیا۔ ایک جزیرہ تھا جہاں ایک تباہ حال بیڑے کے مسافر پہنچتے ہیں اور وہاں کے آرام، سکون اور عیش و عشرت کی فراوانی نے انھیں وہیں کا بنا دیا۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔

یہ افیون کھانے والوں کی طرح بس اس سرزمین سے چپک کے رہ گئے۔ یہ محنت مشقّت اور زحمت کشی سے جی چراتے تھے۔

All things have rest, why should we toil alone.
We only toil who are the first of things
And make perpetual moan
Still from one sorrow to another thrown

تقریباً انہی خیالات کو کلیم صاحب نے ذرا تیکھے انداز میں مشرقی ماحول کے مطابق، مشرقی پڑھنے والوں کے مزاج کے لئے رانہ گا بطور پر پیش کیا ہے، وہ کیسی سرزمین ہے، جہاں یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ اس کا بیان بھی اس نظم میں ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا ذکر بھی :

There is sweet music here that softer falls
Than petals from blown roses on the grass

اختر شیرانی نے بھی اسی طرح کی نظم سے متاثر ہو کر ایک چھوٹی سی پیاری نظم کہہ ڈالی ــ "اے عشق کہیں لے چل"۔ اس نظم میں بیقراری اور ایک تڑپ ہے۔ لیکن اختر کوئی تخیلی دنیا متعیّن نہیں کرتے۔ صرف حسین نقش و نگار بناتے چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبّت کی محرومیوں سے اُکتا کر ایک لامعلوم کیفیت ان پر فرار کی طاری ہو گئی ہے۔

کلیم صاحب نے دوسرے حصّہ میں اس سرزمین کا حال بیان کیا ہے۔ جس سے ان کی قوت بیانیہ کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے ساتھی کو اس سدابہار مقام کی

سیر کرنے کو کہتے ہیں، یہاں سبزوں کا فرش، مخملی فرش کو مات کر رہا ہے۔ ایک خوشگوار سرمدی سکون چھایا ہوا ہے کہ "نظر نظر میں ہے جنت چمن چمن فردوس" طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں، موتیا، چنبیلی، گیندے سے نظر کو تازگی عطا کر رہے ہیں۔ اس حصہ میں کلیم صاحب ایک فطرت نگار شاعر کا روپ دھار لیتے ہیں اور ان کی جھولی میں فطرت کی غیبی کرشمہ زائیاں سما سکیں، سب ہمارے سامنے بکھیر دی ہیں۔ ہر منظر ہر آن ایک نیا رنگ دکھلاتا ہے اور اس طرح کُل یوم ھو فی شان کی تفسیر سامنے آجاتی ہے۔

نئے نئے ہیں یہ ہر آن ساز جلوہ گری
یہی ہے وحدت و کثرت کا راز جلوہ گری

راسخ عظیم آبادی نے بھی اسی طرح کا خیال ادا کیا ہے:

کیسا بو قلموں جلوہ ہے اپنا محبوب
ایک بھی اس کی تجلّی نہیں تکرار کے ساتھ

یہ نظم انیس اٹینی سن یا غالب کے انداز سے الگ ہے، یہ خیالات و احساسات سے بھری ہوئی نظم ہے۔ تخیل انگیز، معنی خیز اور تصوّر ریز بھی، وہ اس مقدس سرزمین پر ایک گلاب کا پھول کھلا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو ان کا یک خیال وحدت میں کثرت کے جلوے سمیٹے لگتا ہے۔ ایک کلی کو دیکھتے ہیں تو اس ننھی سی جان ہنسی کا ایک ایک ورق آئینہ حیات نظر آتا ہے، یہی آئینہ حیات آئینہ کائنات بن کر حسن ازل کا آئینہ بن جاتا ہے۔ کلی کو دیکھ کر اس کی لطافت، اس کی بناوٹ، اس کی بے نیازی، اس کی حسن کاری سے وہ کلی کے صانع کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ایک ننھی منّی کلی راز کبریائی بن کر جلوہ افگن ہوتی ہوئی

معلوم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کون و مکاں، زمین و آسماں اور خالقِ مکاں و لامکاں کا آئینہ بن کر سامنے آتی ہے:

کلی نہیں، یہ ہے کون و مکاں کا آئینہ
مکاں کے چہرے میں ہے لامکاں کا آئینہ

درخت اس راز کے رازدار ہیں، جو عصمتِ چمن کے پاسباں ہیں جو انواع و اقسام کے پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ فطرت ہر طرف زر و جواہر بکھیر رہی ہے۔ قدرت اپنے خزانے لٹا رہی ہے۔ مناظرِ قدرت کی یہ صناعی، نمود صنعتِ معبود ہے۔ جدھر دیکھو، پھل کیسے میٹھے، رسیلے، خوش آب خوش اندام، شاید ایسے پھل بہشت میں بھی کم مل سکیں:

یہ شاخیں بوجھ سے دبتی ہیں اس طرح گویا
وہ کہہ رہی ہیں کہ لو توڑ لو، لو انہیں چکھو

وہ اپنے رس بھرے ہونٹوں سے چومتے ہیں تمہیں

اب ٹینی سن کی نظم کا یہ ٹکڑا پڑھیے:

Lo! Sweeten'd with the Summer light
The full juice apple, waxing over mellow
Drops in a silent autumn night

جو تخیل جنت الفردوس کا ہمارے یہاں ہے۔ کلیم صاحب نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ۲۰۱ مصرعوں کی اس نظم میں انھوں نے جنت کے وجود کا جواز پیش کیا ہے۔ حالانکہ مغرب زدگی کا کمال تو ہے، جنت سے انکار۔

وہ جامِ شہد لئے مسکرا رہا ہے کوئی
وہ سلسبیل لطافت بہا رہا ہے کوئی

رفتہ رفتہ شاعر کا مشاہدہ تیز اور گہرا ہوتا جا رہا ہے، وہ ساحل دریا کو دیکھتا ہے، تو ریگ ساحل اسے چادر اطلس نظر آتی ہے۔ یہاں کی دھوپ بھی ملائم ہے۔ پتے پتے پر کیف آگیں رنگ بھرے ہوئے ہیں، مرے خیال میں یہ استعارہ ہے۔ اس امر سے کہ اس بستی میں ہر جگہ سکون ہے۔ رحمت ہی رحمت ہے، اگر زحمت ہے، حدّت ہے، شدّت ہے، تو سب کی سب اپنا اثر بدل چکی ہیں، یہاں محنت کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر محنت کرنا بھی ہے، تو وہ محنت نہیں بلکہ بہرہ اندوزی لطافت ہو جاتی ہے۔

موجوں کا خمار آلود ہونا، اور لڑکھڑا کے چلنا، ایک چھوتا خیال ہے سودا کا شعر ہے:

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے، خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

لیکن یہاں ایک شگفتہ اور اوریجنل تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ ہلکا سا رنگ گلرا نسیم کے ایک شعر کا اس میں مل جاتا ہے:

وہ لڑکھڑاتی ہیں، کیسا خرام ناز ہے یہ
کہ جیسے کوئی حسیں صبحدم وصال کے بعد
لجا لجا کے چلے اور قدم قدم پہ رُکے

شاعر اس گلشنِ بقا میں بھی فنا کے کرشمے دیکھ ہی لیتا ہے اور تھوڑے وقفہ کے لئے اس کا خیال انسانی حیات کی مایوسی و مجبوری کی طرف منعطف ہو

جاتا ہے۔ یہ موجیں ساحل سے ٹکرانے کو مضطر ہیں۔ کنارے پر آجانا چاہتی ہیں، لیکن آنے اور چلے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر وہ ساحل تک پہنچ نہیں پاتیں، ان موجوں کی بیتابی کا کیا حال ہوگا:

قسمت پہ اس مسافرِ بیکس کے روئیے ؎ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

پہنچ کے بھی لبِ ساحل پہنچ نہیں پاتیں
وہ آئی منزلِ مقصود۔ وہ اجل آئی

فنا کے اس احساس نے جو تکدّر پیدا کر دیا تھا، اس کو شاعر سمندر کی پُرسکون نیند کے نظارے میں گم کر دینا چاہتا ہے، یہاں پر اقبال کی نظم ایک آرزوئے بے ساختہ ذہن میں آجاتی ہے، اس میں بھی وہی فرار شور و شغب کی تمنا ہے، مگر بالکل محدود، اقبال کا دل بھی دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا تھا، وہ کہتے ہیں: ؎

شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا ؎ ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

یہ دو اشعار خاص طور پر یاد آتے ہیں:

آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ ؎ پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی ؎ جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

اب شاعر کی نظر سکون طلب شفق کی رنگینیوں پر پڑتی ہے۔ قوس قزح کے ساتوں رنگ پر وہ فلک پر جھلمل جھلمل کر رہے ہیں، ہر طرف رنگ برنگ کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ اتنے میں اس کی نگاہ ایک ستارہ پر پڑتی ہے۔ اس ستارہ کو دیکھ کر وہ پھر فلسفہ حیات اور رقص حیات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، آسمان پر بزم نور سجی ہوئی ہے، محفل رقص و سرود قائم ہے اور ساری کائنات وجد

كليم الدين احمد

میں آگئی ہے، مکاں بھی رقص میں ہے، لامکاں بھی رقص میں ہے، ——
وہ حسن معصوم ہر جگہ پراگندہ نقاب پھر رہا ہے۔ یہ سارے مناظر اس کے
لئے آئینہ ساماں بن گئے ہیں، دکھاؤ حسن کو آئینہ یہ بھی خدمت ہے۔

شاعر ایک حد تک اپیقورس کے فلسفہ "کھاؤ پیو موج کرو" کو پسند کرتا ہے۔
یہ دلفریب مناظر یہ نہہ در نہہ بار رقص و سرود اس کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا کرتے
ہیں۔ غور کیجئے تو ایسا پتہ چلتا ہے کہ اس سیر و تفریح میں وہ کچھ تھک سا گیا ہے
اور یہ آرام کے لئے پھولوں کی سیج تیار ہے۔ یعنی جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر
مجسّم سامنے ہے۔

اب آؤ بستر نکہت پہ کوئی دم لیٹو
اب آؤ خواب کی زلفوں کو ذرا دم کھیلو

یہاں کلیم صاحب نے غالب کے شعر سے اچھا کام لیا ہے:

وہ اور آرائش خم کاکل ٭ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

یہ اندیشہ ہائے دور دراز جہاں نئی اور انوکھی تعمیر میں مبتلا کرکے
انسان کی خودی کو خود فراموشی سے بدل دیتے ہیں اور خود فراموشی، خودی
کی موت ہی تو ہے، ہمیں بیخودی کو بیدار کر کے اپنی خودی کو ابدی نیند نہیں
سلانا چاہیئے، یہ کیسا تہ در تہ، پیچیدہ اور مرصع خیال ہے اور ہر طرح شاعرانہ
حسن سے بھرا ہوا، شعر کا شعر ہے، پیغام کا پیغام:

خودی سے دیکھو اُبھرتی ہے خود فراموشی
خودی کی نیند ہے یہ بیخودی کی بیداری

آخری حصہ، یہ تیسرا حصہ اس سرزمین پر بس رہنے کے بعد کے جذبات و

وتجربات کا بیان ہے خوشی اور مسرت، ہر قدم پر نثار ہو رہی ہے۔ رواں، جواں اور اپنی قسمت پر نازاں زندگی ہر طرح کی برنائی اور رعنائی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے رنگ و بو کی محفل میں، اپنی قسمت پر مطمئن ہے:

ہر دم ہنسی ہے، ہر دم خوشی ہے
کیا زندگی ہے، کیا زندگی ہے
کیا عیش عریاں کیفِ نہاں ہے
آرام دل ہے، آرام جاں ہے
ظاہر سکوں ہے، باطن سکوں ہے
اوّل سکوں ہے، آخر سکوں ہے

اب ذرا یہ سطریں پڑھئے:

Let us swear on oath, and keep it with an equal mind
In the hollow Lotos-land to live and lie reclined
on the hills like Gods together, careless of mankind

---

(۹) ۱۵۶ مصرعوں کی اس نظم میں کلیم صاحب نے ایک نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، اس شخص کا جو قتل جیسے بھیانک جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قتل و خون کہیں نہیں چھپ سکتے۔ معصوم کا خون قاتل کے اندرون و بیرون دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع 'جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا'۔ سات دن ہوئے

کہ ایک شخص نے ایک معصوم انسان یعنی اپنی محبوبہ کو قتل کر دیا ہے، قتل کے بعد وہ ایک لمحہ بھی چین سے نہ رہ سکا، مقتول کا بھوت اس کو برابر ستا رہا ہے اس کا واہمہ ہر آہٹ پر چوکنا ہو جاتا ہے، اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب کا ہی قتل کر دیا ہو، اس کے ابتدائی دور میں پس منظر کے طور پر طوفان کا تلاطم دکھلایا گیا ہے، جو درحقیقت اس کے اپنے دل کے اندر برپا ہے وہ برابر یہی کہہ رہا ہے:

یہ کون دیکھو تو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے

اس مہیب تصوّر کے آتے ہی اس کے ضمیر میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے، احساس جرم اس کو طوفان بن کر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے:

ہوائیں آج یہ کیا شور و غل مچاتی ہیں
ڈکارتی ہیں، گرجتی ہیں، دندناتی ہیں
یہ ابر و رعد کے کڑکے، یہ برق وش طوفاں
یہ زلزلے ہیں فضا میں، فضا لرزتی ہے

اس طوفانی احساس کے کم ہوتے ہی اس کو بیتے دنوں کی یاد آجاتی ہے اس کے سامنے وہ معصوم مقتول دندناتا ہوا آجاتا ہے۔ رہ رہ کر اس کو اس گناہ کے احساس کا دورہ پڑ رہا ہے۔ اس کو گو نہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ:

بھروسے بند ہیں، دروازوں میں ہیں مقفل پڑے
یہ اونچی اونچی سی دیواریں کون پھاندے گا

اس کا دماغ ماضی کے رخشاں تصوّر سے نور آگیں ہو رہا تھا اور اس کو

اپنا ساقی مہوش سراپا ادا و ناز کا مجسمہ رہ رہ کے یاد آرہا تھا کہ یکایک وہ ساری یادیں بچھل جاتی ہیں اور وہ روشنی سے یکبارگی تاریکی میں منتقل ہو جاتا ہے اب وہ آواز کچھ قریب سے آنے لگی۔ ان بند کواڑوں کو یہ کون آج کھولتا ہے مگر جو دیکھا تند ہوائیں ہیں اور کوئی نہیں :

مرے خیالوں کا طوفان ہے مرے دل میں
برس رہی ہیں خیالوں کی بارشیں کیا کیا

بارش کا برسنا ٹھیٹھ بہاری انداز بیان ہے۔ عجب بے بسی کا عالم ہے، ایک بیکلی ہے، انتہائی وحشت ہے۔ کوئی بھی غمخوار ایسا نہیں جس سے اپنے دل کا غم کہے اور اپنے بوجھ کو ہلکا کرے، اس کو بیتی یادوں کی بجلیاں تڑپنے کی بھی اجازت نہیں دیتیں، خون خون، بے گناہ خون، معصوم خون، بے آواز خون، جہاں دیکھو اسے خون ہی خون نظر آتا ہے :

یہ خوں کے چشمے اُبلتے ہیں کیسے دیکھو تو
لہو کی موجیں خروشاں ہیں کیسی دیکھو تو
یہ پھول دیکھو تو، کیا خونِ دل سے لال ہوا
یہ عطر سونگھو تو اس میں لہو کی خوشبو ہے
تباہ خون سے رنگیں ہیں کیوں در و دیوار

نفسیاتی ژرف نگاہی کی یہ ایک کامیاب مثال ہے، شدت احساس جرم کو پیکر جاندار بنا کے ڈراتا رہتا ہے، خوف کا ہیولیٰ ہر آن اس کو چھیڑتا رہتا ہے۔ یہ جنون کی ایک منزل ہے، سارے خیالات جو اس کے تحت شعور و لاشعور میں دبکے چھپے ہیں، یکبارگی نکل آنے پر تُل گئے ہیں ۔ تھوڑی دیر حقیقت کے احساس

کی طرف آتا ہے، مگر پھر کسی کی دستک درِ دل پر سُن کر چونک اٹھتا ہے عجیب کرب و اضطراب سے دوچار ہے، ان دستکوں نے قریب سے سنائی جانے والی آہٹوں نے اس کو مجبور کر دیا کہ باہر جھانک کے دیکھے کہ کون مہمان، بے وقت کا مہمان بن کر آیا ہے، مگر اس کی مایوسی اور گہری ہو جاتی ہے۔ شب سیاہ، یہ سونی سڑک کا سناٹا، بار دیگر اس کا واہمہ نئی نئی شکل بنا کر اسے ڈرا رہا ہے۔ اب اس کو ایک حلقۂ چشم دکھائی پڑتا ہے۔ گویا کسی کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے، اس کے کرتوت کو دیکھ رہی ہے۔ یہ حلقہ رفتہ رفتہ ہڈیوں کا حلقہ بن جاتا ہے ایک نحیف سا، بے کیف اور بے شرار حیات ہڈیوں کا حلقہ یہ استخواں کا ٹکرا، پھر اس کے تحت شعور میں ٹھوکریں لگا لگا کر اس کے محبوب کی یاد دلاتا ہے، وہ اس کا گلاب سا چہرہ، موتی سے دانت، وہ قلقل مینائے خندے، وہ نقرئی تبسّم ــــ کسی انجانی طاقت نے اس کو دروازہ کی طرف دھکیل دیا:

جو میں نے دیکھا، جو کھڑکی کے پاس جا دیکھا
نہ استخواں تھے، نہ وہ استخواں کے حلقے تھے
نہ دانت تھے، نہ مرے استخواں کا خندہ تھا

پھر وہ ہوش میں آنے ہی کو تھا کہ ایک جھنکار کی آواز اس کے کانوں کے پردوں کو چیر گئی، اور بیک وقت صدہا طوق و سلاسل فریادی بن کر کراہ اور چیخ بلند کرنے لگتے ہیں:

یہ کیسا قیدئ زنداں کو حکم جنبش ہے
اور ان کے طوق و سلاسل سے شور اٹھتا ہے

اس کی دیوانگی بڑھتی ہی جارہی ہے، رہ رہ کے سکون لٹ رہا ہے۔ اس نے اپنے محبوب کو قتل کیا، لیکن اس نے اپنے شوق، اپنے ارمان کا آپ ہی گلا گھونٹ دیا، اس کی رگوں میں محبت کا خون اُبل رہا تھا کبھی اس کی آنکھوں میں وفا کی چنگاریاں، موتیوں کی مالا بن کر، اس کے گلے کا ہار بنا کرتی تھیں۔ آج - آج':

مرا وہ ہار کہاں ہے، مرا نگار کہاں
مرا وہ تاج کہاں ہے، مرا سراج کہاں

اب تو وہ کھوجتے کھوجتے، اس آواز کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک کر چور ہو گیا۔ سات دن آئے اور گذر گئے، مگر اس کی پلک سے پلک نہ لگی۔ اس بے خوابی نے اس کے اعصاب کو مفلوج کر دیا ہے، وہ آواز، وہ آواز مجسم اب اس کے پاس آجاتی ہے، اور وہ مجبور یہ کہہ اٹھتا ہے:

اب آؤ دیکھو مجھے کوئی دم تو سونے دو
یہ میری آنکھیں جھپکتی ہیں، جھپکی جاتی ہیں
یہ میرا سر بھی ہے بوجھل جھکا ہی جاتا ہے
اب آؤ خواب کی آغوش میں ذرا بیٹھیں
اب آؤ لیٹیں یہ بستر ہے منتظر کب سے

یہ ایک ڈرامیٹک مونولوگ ہے۔ اس لئے ابتدا کی خبر نہیں اور انتہا بھی پوری طرح واضح نہیں۔ مگر ڈراموں میں اس طرح کا المیہ اپنی تندیٔ احساس کے ساتھ ملتا ہے شیکسپیئر نے اپنی بعض ٹریجڈی میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے اور نفسیاتی کش مکش کو منطقی حد تک پہنچا کے دکھلایا ہے، میکبتھ کا ڈراما اس نفسیاتی اُلجھن کی

اچھی مثال ہے۔ یہاں تین تین قتل ہوئے ہیں اور قتل کا مقصد دافع بھی ہے۔ اس لئے ندامت کا بھوت لیڈی میکبتھ اور خود میکبتھ کے سر پر سوار ہے۔ کلیم صاحب کی نظم میں قتل کا واقعہ اکہرا ہے۔ اس لئے ایسی شدّتِ احساس اور تندی جنوں کی منطقی توجیہہ ہاتھ نہیں آتی، مگر یہ ہے ڈرامیٹک مونولوگ، جس میں واقعات نہ تو مکمل بیان ہوتے ہیں اور نہ ان میں کوئی پیچیدگی ہی پائی جاتی ہے اس لئے قارئین کو ان کے جاننے کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔

خون کہیں چھپائے چھپتا ہے، لیڈی میکبتھ نے بڑی احتیاط برتی۔ مگر خود اس کے جنون نے راز فاش کر دیا، ڈنکن، بے گناہ ڈنکن کے قتل کے بعد میکبتھ اور لیڈی میکبتھ کے منصوبے اور بھی گھناؤنے ہونے لگے اور اپنی راہ کا ہر کانٹا دور کرنے کے لئے تابڑ توڑ معصوم خون سے وہ اپنے ہاتھ رنگتے رہے۔ ڈنکن کے قتل کے بعد ہی میکبتھ کو کوئی آواز سنائی پڑنے لگی، یہی انتقام کی آواز، بے گناہی کی آواز تھی:

Whence is that knocking? How is it with me when every noise appals me ?

لیڈی میکبتھ برابر اپنے شوہر کو تسلّی دیتی رہی۔ کبھی کبھی طعنوں سے بھی باز نہ آتی۔ مگر میکبتھ برابر اس خونی منظر سے ڈرتا رہا۔ وہ ہر چیز میں خون دیکھتا ہر جگہ اسے خنجر نظر آتا، جدھر دیکھتا وہی خنجر، وہی خون آلود جسم، اس کو یقین ہے کہ وہ بھیانک منظر اس سے انتقام لے کر رہے گا:

It will have blood they say, blood will have blood

میکبتھ کا اثر لیڈی میکبتھ پر پڑ کر رہا۔ وہ بھی اپنے کرتوت کو یاد کرنے لگی اور برابر اپنے ہاتھ کو ملتی رہی، جیسے کہ اس کے ہاتھ میں خون کے دھبے ہوں جن کو وہ دھو ڈالنا چاہتی ہے، رفتہ رفتہ یہ احساس ایسا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ بھوت بن کر اس کو ستاتا ہے اور وہ نیند میں اِدھر اُدھر گھوم کر ساری کہانیاں کہنے لگی:

Lady Macbeth :- Here is the smell of the blood still all the perfumes of Arabia will not sweaten this little hand, oh, oh, oh

Wash your hands, put on your night gown look not so pale I tell you yet again Banquo is buried. He can not come out on's grave.

اس کے بکواس نے وہ راز، جو ابتک پنہاں تھا آشکار کر دیا۔ کلیم صاحب کہتے ہیں:

وہ راز جس کو چھپایا ہے تم نے دنیا سے
وہ راز حجرۂ دل میں ابھی جو پنہاں ہے
وہ راز آج مجھے آشکار کرنا ہے

ڈاکٹر نے ساری کہانی سُن لی، مجرم نے گناہ کا اعتراف کر لیا، ایک بستر پر ایڑیاں رگڑ کے مری، دوسرا میکڈف کے ہاتھوں قتل ہوا، ——— مگر کلیم صاحب نے ٹریجڈی کا بڑا ہی تیکھا احساس دلایا ہے۔ قاتل نے خودکشی کر لی، خودکشی کرنا بڑی جرأت کا کام ہے اور آخر آخر تک اس سے جرأت کا اظہار ہوتا رہا۔ رہ رہ کر اس کے دماغ میں وہی خیالات اُبھرنے لگتے ہیں، اس کو کسی پہلو قرار نہیں، ایک پل چین نہیں، ذرا سی دیر بھی اس کو آرام میسر نہ آیا، وہ بستر

آرام سے اٹھ بیٹھا ہو:

یہ کون کہتا ہے اُٹھو میں خواب کشتہ ہوں
یہ کس نے میرے گلے پر چلا دیا خنجر
سکون دل پہ یہ کس نے چلا دیا خنجر
یہ کس نے نیند کو، آرام کو ہلاک کیا

اب پھر وہ باؤلا ہو جاتا ہے، آسمان پر ہلال عید جلوہ گر ہے۔ عید اپنے ساتھ پیام دید لاتی ہے، اور نوید مسرت لاتی ہے۔ مگر اس کو عید کا چاند، خون کا ایک لال چاند نظر آ رہا ہے۔ جیسے وہ کسی کے لہو میں نہا کے نکلا ہو، اب اس کی بے تابی اور بھی فزوں ہو گئی۔ اس نے لاکھ چاہا کہ اس قتل کا راز، اس دیوانگی کا راز چھپائے رکھے، مگر دائے مجبوری وہ اسے چھپا نہ سکا۔

وہ دیکھو کون ہے سویا ہوا سلایا ہوا
یہ دیکھو مرمریں سینہ، یہ دیکھو خنجر سرخ
یہ یاسمن پہ ہیں کیسے گلاب کے چھینٹے

وہ گلرو خون میں لت پت سامنے فرش زمیں پر بے یار و مددگار ہے ـــــ مگر وہ اب جو ادھر اُدھر دیکھتا ہے، اپنے آس پاس ٹٹولتا ہے، تو کچھ نہ تھا، ـــــ

اب اس کی بے تابی حد سے سوا ہو گئی۔ وہ اس آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہو جاتا ہے، انجانے طور پر وہ کہہ اٹھتا ہے:

وہ آیا! دیکھو وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
میں جانتا ہوں یہ کیوں آج اتنی دستک ہے

شبِ جدائی گئی، صبحِ وصل آپہنچی
میں آ رہا ہوں، درِ دل پہ اب دستک دو
جو تم نہیں تو یہ دنیا اجاڑ لگتی ہے

اور وہی خنجر جو اس نے اپنے محبوب کے سینے میں گھونپ دیا تھا، اب اس کے سینہ میں پیوست ہونے کو ہے اور یہی ہے علاج اس دیوانگی کا، یہی ہے خراج محبت کا اور یہی ہے انتقام اس معصوم خون کا:

یہ مرا سینہ ہے اور لال لال خنجر ہے
تمہارے خون نے بنایا تھا سُرخرو جس کو
وہ خون دل میں مرے اب نہا کے نکلے گا

اس طرح کی نفسیاتی الجھنوں کی دریافت اردو شاعری میں اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اردو داں طبقہ ایسے احساسات سے نامانوس سا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس تجربہ کی ناقدری بھی کی جائے۔ انگریزی ادب میں یہ سلیقہ بالیدہ ہے اور شعراء بڑے رچے ہوئے تجرباتی شعور کے مالک ہوتے ہیں۔ انگریزی کا شاعر والٹر ڈی لامیر کی نظم عربستان (Arabia) میں ہم اسی سے ملی جلی تو ہماتی آہٹیں اور آوازیں سنتے ہیں، وہاں بھی اس کا خواب اس کا واہمہ سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

'They haunt me, her lutes and forests
No beauty on earth I see
But shadowed with that dreams recall
Her love liness to me

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلیم الدین احمد کے اشعار کا دوسرا مجموعہ '۲۵ نظمیں' اگست ۱۹۶۶ء میں
زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ یہ ان کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے۔
دراصل اس میں ۲۶ نظمیں ہیں۔ ایک نظم کو اصل کتاب میں شمار نہیں کیا گیا ہے اس
مجموعہ میں بھی جتنی نظمیں ہیں ان میں کسی کا عنوان نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ پہلی سطر کو ہی
فہرست میں عنوان کے طور پر لکھا گیا ہے۔ عنوان دینے سے اجتناب کلیم صاحب کی
جدّت پسند طبیعت کا رجحان ہے اور مغربی ادب کا اثر:- انگریزی کے بعض شعراء
مثلاً جیرارڈ مینلی ہوپکنس Gerard Manly Hopkins سی، ڈے لیوس
C.Day Lewis - ڈبلیو، ایچ اوڈن W. H. Auden اور اڈیتھ سیٹول،
Edith Sitwell نے اپنی بعض نظموں کے عنوان میں پہلی ہی سطر رکھا ہے۔
گرچہ ان کے یہاں ایسی نظمیں بھی ہیں، جن کے عنوان دے دیئے گئے ہیں۔ اردو میں
یہ سارے تجربے نئے نئے آئے ہیں اور یہ تجربے اتنے دبیز، اتنے تہہ دار اور ایسے
پیچیدہ ہیں کہ خود کلیم صاحب ان کی گرہ کھولنا پسند نہیں کرتے۔ قارئین جو چاہیں عنوان دیدیں۔
عنوان کے انتخاب سے بھی تو شاعر کے مذاق اور میلان کی غمازی ہوتی ہے۔ اس لئے
عنوان کا انتخاب انھوں نے قاری پر چھوڑ رکھا ہے۔ ہر پڑھنے والا اپنے تاثر کے تحت

(۱۰) اس نظم میں ۲۱۴ مصرعے ہیں، جن کو دو تصویروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، یہ نظم زندگی کی ایک اُبھری ہوئی اور ٹھوس حقیقت کو ہمارے سامنے لاتی ہے، اس میں افلاس کی لعنت دکھائی گئی ہے اور سرمایہ داری کی رعونت، شاعر اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے نہیں گذر جاتا، بلکہ وہ اگر آنکھیں بند کرنا بھی چاہے، تو تصوّرات کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور وہ ان تجربات سے دامن چھڑا کر بھاگ نہیں سکتا۔ کلیم صاحب بھی شاعر ہیں ایک ماحول ان کا بھی ہے، وہ اپنے ماحول سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے تاثرات کو اکثر ماورائی قسم کی چیز بنا کر پیش کرتے ہیں، جن میں کسی مٹی کی بو نہ آئے، یہ سرمایہ داری پر نظم نہیں ہے، بلکہ دو طرح کے متخالف تجربوں کا اظہار ہے، تجربے تو پرانے ہی ہیں، وہی جو مارکس اور لینن کے توسط سے ہم تک آئے ہیں۔ لیکن ان تجربوں کو وہ تخیلی رنگ میں اس طرح تحلیل کر دیتے ہیں کہ اس طرح کی مقصدی شاعری کی کثافت خود بخود چھن کر نکل گئی اور اب لطافت ہی لطافت باقی رہ گئی۔ نظم میں کوئی واقعہ ہوتا ہے جو مرکز ثقل کی طرح دوسرے نئے نئے تجربات کو مرتکز کرتا ہے، اس نظم کا مرکز ثقل اس کے آخری دو مصرعوں میں نہاں ہے:

بدل کر بھی دنیا بدلتی نہیں ہے
محل میری جاں یوں ہی بنتے رہے ہیں

عام طور پر سرمایہ داری یا افلاس پر جو نظمیں ملتی ہیں۔ ان میں کم ہی ایسا ہے کہ تجربے شاعر کے اپنے ہوں، وہ ادھار پنچے کے تاثرات سے الفاظ کا ایک جال بن دیتے ہیں، انھیں اس کا شعور نہیں کہ الفاظ اور تجربات میں

ناگزیر تعلق ہے، بعض اوقات وہ سجل اور چمکدار الفاظ کے چکر میں اصل تجربہ سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، شاعر کی شخصیت اپنی زبان آپ بناتی ہے، شاعر زبان کا فرماں روا ہے، فرماں بردار نہیں۔ کلیم صاحب نے اس گُر کو اچھی طرح سمجھا ہے، وہ الفاظ کی فصاحت اور پاکیزگی پر دھیان نہیں دیتے کہ ان کو اپنے اصلی جذبات کو اصلی حالت میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ یہ نظم کسی حال سے سرمایہ داری کے خلاف زہرافشانی نہیں کہی جا سکتی اور نہ افلاس و فلاکت کا پروپگنڈا، امیری اور غریبی زندگی کے دو پائدار تجربے ہیں، جن سے ہر کس و ناکس کو واسطہ پڑتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہونے کے بعد ہی ہندوستان میں سرمایہ داری کا عفریت جاگ اٹھا۔ یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت ہے، جو سرمایہ داری انسانیت کے ماتھے پر کوڑھ کا داغ ہے۔ اس کا گذر کسی مذہب میں نہیں، دولت سمیٹنا اور شئے ہے اور حق والوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا اور شئے ہے، جو سرمایہ داری حق اللہ اور حق العباد دونوں کی پاسبانی کرتی ہے وہ رحمت ہے لعنت نہیں۔ جو سرمایہ داری خشیئت ایزدی سے تربیت پاتی ہے۔ وہ انسان کے عروج کی دلیل ہے۔ یہ وہ سرمایہ دار ہیں اَلَّذِینَ فِی اموالھم حق معلوم للسّائل والمحروم (یہ لوگ وہ ہیں جن کے مال میں سائل اور محروم کے لئے متعین کردہ حقوق ہیں)۔ مگر آج کل کے سرمایہ دار کہ "ایں جادو نوا مارا ز گل بیگانہ می سازد" کا مصداق سارے حقوق و فرائض کو طاقِ نسیاں پر رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال نے بھی سرمایہ داری کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، آقا

اور غلام۔ حاکم اور محکوم کے باہمی کشاکش پر انھوں نے فکر کیا ہے، لیکن انھوں نے ایسا نظریہ پیش کیا جس سے سرمایہ دار اور مزدور کی آویزش ختم ہو جا سکتی ہے۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ یہ کسوٹی ہے انسانیت کے پرکھ کی، ورنہ امیری اور غریبی تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے اِنَّہٗ ھُوَ اَغْنیٰ وَ اَقْنیٰ (وہی غنی بناتا ہے اور وہی سرمایہ باقی رکھتا ہے) اس لئے بذات خود افلاس نہ دولت لعنت نہیں ہاں ان سے کام لینے والے کبھی کبھی ملعون ہو جاتے ہیں۔

کلیم صاحب نے اس نظم میں اقبال کے تربیت یافتہ جذبہ کو تو نہیں پیش کیا ہے۔ لیکن اپنا ایک تجربہ، ایک خالص تجربہ سامنے رکھا ہے، کوئی ضرور نہیں کہ شاعر سرمایہ داری کی مذمت ہی کرے۔ سرمایہ داری کے لوازم و عواقب بیان کرنے سے ذم کا پہلو نکل ہی آتا ہے اور یہ پہلو شاعری کے سانچے سے الگ بھی نہیں ہوگا۔ یہاں بھی وہ سیاسی کشمکش اور معاشرتی تحریکات سے ناوابستگی کے باوجود، سراسر بے تعلقی قائم نہ رکھ سکے، لیکن ان کو یہ معلوم ہے کہ سرمایہ داری یا اشتراکیت سے کہیں ارفع و اعلیٰ شاعری کے تقاضے ہیں۔ انھوں نے سرمایہ داری و اشتراکیت کو فاعلی اور انفعالی دونوں آئینوں سے دیکھا ہے۔ اشتراکیت پر ان کی نظم آگے آ رہی ہے، ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند شعرا نے تو سرمایہ دار کے خلاف علم بغاوت ہی بلند کر دیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اس 'محبوب کل' مضمون پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اور کون ہے جس نے انقلاب کا نعرہ نہ لگایا ہو، حد یہ ہے کہ اقبال بھی کہہ اٹھتے ہیں۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب ‏ ‏ ‏ ‏ از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

قسمت نامہ، سرمایہ دار و مزدور، اور نوائے مزدور میں سرمایہ دار کی حیلہ گری اور بد طینتی کا اظہار یوں ہوا ہے:

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من
گلبانگ ارغنون کلیسا از آن تو
این خاک و آنچہ در شکم او از آن من
وز خاک تا بہ عرش معلا از آن تو (قسمت نامہ)

اس کا ردعمل، مزدور کی خود شناسی سے ظاہر ہوتا ہے:

بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم

گویا اقبال بھی کڑوی کسیلی باتیں سرمایہ داروں کو سنا گئے ہیں، یہ واضح ہے کہ یہ سرمایہ دار وہ ہیں، جو کسی اخلاقی قانون کے پابند نہیں، نہ کسی کی ملامت کی پروا، نہ کسی کی دشمنی کا خوف "کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ" کہکر اقبال سرمایہ داری کو خدائی قہر کا شکار دیکھنا چاہتے ہیں:

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ⁂ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ترقی پسند حضرات کے لئے بلکہ آج کل ہر طفل سیاست کے لئے سرمایہ داری کے خلاف آڑے ترچھے نشان بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سرمایہ داری پر کس کس نے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کی نظم غریبوں کی صدا ایک بھکاری کی آواز معلوم ہوتی ہے، جو اپنے دکھ درد بیان کرکے بھیک سے اپنی جھولی بھرنا چاہتا ہے۔ مجاز نے یہ کہکر:

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے :: بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

(سرمایہ داری سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے، علی سردار جعفری بھی سرمایہ داری کے خلاف لفظی جہاد میں مشغول رہے ہیں اور سیماب اس طرح اپنے غصّہ کا اظہار کرتے ہیں : ؎

خود بچوڑی تو نے دولت خون سے مزدور کے :: اور پھر غمخواری مزدور بھی ہے تجھ پہ بار

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ کلیم صاحب نے تماشائی کی حیثیت سے سرمایہ دار اور غریب انسانوں کو دیکھا ہے اور جو دیکھا ہے وہ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے، صرف ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں وہ تجربے کے ساتھ اپنے تاثر کو بھی ملا دیتے ہیں، پہلے بند کا آخری حصّہ قابل غور ہے۔ یہاں ان کا مشاہدہ اور ان کا ردعمل دونوں جھلک رہا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ افلاس سے مجبور ہو کر، بھوکوں کے محتاج انسان اپنا سب کچھ بیچ رہے ہیں۔ اور اس بیچنے کا اس طرح جواز بھی نکل آیا ہے۔ لفظ 'بیچیں' کی تکرار ہر مصرع میں ایک نیا زور لاتا ہے، چونکہ مقصد غیرت کو جھنجھوڑنا ہے، غیرت کو بیدار کرنا ہے، اور عصمت کی قدر و قیمت بتانی ہے، اس لئے جزوی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ گرچہ غربت میں آکر عزت و ناموس، بہن دنیا اور عقبیٰ بیچنے کا جواز قابل قبول نہیں، ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھوک کی تیزی سے کچھ نجات حاصل کرتے تھے، انھوں نے درختوں کی پتیاں کھائیں، چمڑے کو چبا چبا کر آنتوں کی تسکین کی مگر کسی سے اخلاق سوز حرکت سرزد نہ ہوئی، اس لئے کہ شکم سیری کا سوال زندگی کے لئے ضروری تو ہے، مگر زندگی کی اور بھی ضرورتیں ہیں، جن کو نبھانا بھی انسانیت کا کام ہے۔

پہلی تصویر کے دو ٹکڑے عقبی زمین کے طور پر آئے ہیں، ایک پرسکون دیدہ زیب، دلکش سماں پیش کیا گیا ہے۔ فطرت اپنے زیور سے آراستہ ہے پہاڑ، آبشار، دریا سب خوشی کے نغمے گا رہے ہیں، مسرت اور سکون کے اس پس منظر میں شاعر اپنی محبوبہ کو ایک بھیانک منظر دکھاتا ہے، یہ بستی غریبوں کی ہے، مفلسوں کی ہے، غریبی اور مفلسی ساری نحوستوں کا پیش خیمہ ہیں، یہاں حالی کے مسدس سے اچھا سا کام لیا گیا ہے:

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے — فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے

پہلی تصویر غربت اور افلاس کی ہے۔ یہ ایسی بستی ہے جہاں گندگی اور غلاظت پھیلی ہوئی ہے۔ بچے کھلائے ہوئے ننگے، بھوکے، بیمار، خاک میں اٹے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ جن پر نہ تعلیم کا اثر ہے، نہ تہذیب کا، یہ آدمی کے بچے کتے کے پلے معلوم ہو رہے ہیں۔ جو ایک ہڈی کے لئے آپس میں لڑنے لگتے ہیں — مگر یہی بچے تو آگے چل کر جوان ہوں گے اور کون جانتا ہے کہ یہی وارث تاج و تخت بن جائیں۔

یہ ملک ان کا ہوگا، یہ مال ان کا ہوگا
زمیں ان کی ہوگی، فلک ان کا ہوگا
مکاں تو مکاں، لامکاں ان کا ہوگا

اس بستی میں بھی عورتیں ہیں۔ مگر ایسی جن کو دیکھ کر گھن آئے۔ نہ تو ان میں نسوانی لطافت ہے، نہ رعنائی، افلاس نے ان کے چم خم ختم کر دیئے۔ ان میں حسین بھی ہوں گی، مگر عسرت و تنگدستی نے ان کے حسن پر بہار آنے کے پہلے

ہی خزاں کے آثار پیدا کر دیئے۔ یہ بدسلیقہ عورتیں میلی کچیلی رہتی ہیں۔ اس انداز سے رہتی ہیں کہ ان کا نسائی کردار ختم ہو گیا ہے۔ یہ آنکھ پسار کے دنیا کو دیکھتی ہیں اور اپنی ضرورت کے لئے پیسوں کی فکر میں رہتی ہیں اور پیٹ پالنے کی فکر میں اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں اور شاید اس پر بھی ان کو شکم سیری میسّر نہیں آتی ہے۔

دوسری تصویر امارت اور تموّل کی ہے۔ یہ ایک روشن و عالی شان محل ہے۔ بلند بہت بلند:

بلندی میں جس کی زمیں آسماں ہے
مسیحا بھی حیراں ہے کس کا مکاں ہے

اس کی مرمر کی دیوار، مرمر کی زمین، مرمر کے ستون، دلوں میں عجیب شگفتگی پیدا کر رہے ہیں۔ ہر چہار طرف حسن اور دلکشی بکھری ہوئی ہے، مکان ہر طرح سجا ہوا ہے اور عیش کے سارے سامان مہیا ہیں، کمخواب، مخمل، ریشم کے بستر، اونچی اونچی ڈالیں۔ یہ ایوان یزداں مکاں دیکھو تو بے ساختہ زباں پر یہ آجاتا ہے:

زمیں پر نہ دیکھی تو دیکھو یہ جنت
جو اک خواب تھا وہ ہے رنگیں حقیقت

مسرت و کامرانی کو مکمل کرنے کے لئے ایک باغ کا نقشہ بھی پیش ہوا ہے جتنے پھول اس چمن میں کلیم صاحب نے کھلائے ہیں، وہ مجموعی طور پر خاطر خواہ اثر کرتے ہیں، برخلاف میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میں جو باغ کا نقشہ پیش ہوا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سارے کے سارے کاغذی پھول ہی کھلا دیئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ

دماغ ان پھولوں سے معطر نہیں ہو پاتا۔ شاید اتنے سارے پھول بیک وقت کھل بھی نہ سکتے ہیں۔

مکان تو حسین ہے، ساتھ ساتھ مکیں بھی حسن کا مجسّمہ ہے۔ یہ بستی بھی حسینوں کی بستی ہے۔ یوں کہئے کہ حسینوں کے چمن یہاں نظر آرہے ہیں۔ اس کاخ ثریا نشان کے رہنے والے ہر طرح خوش ہیں، ہنسی ہے کہ ان کے لب پہ کھیل رہی ہے عورتیں ہیں، جو لطافت اور رعنائی کا پیکر ہیں، جو حور صورت، پری سیرت ہیں، ان کے بچّے بھی پیارے پیارے ہیں، بھولے بھالے ہیں:۔

'فرشتوں نے مانگی ہے ان سے لطافت'

یہاں زمین نے اپنے سارے خزانے اُگل دیئے ہیں، دولت و ثروت کی انتہا نہیں، زر و جواہر کی کمی نہیں، ضرورت کی ہر چیز فراوانی کے ساتھ میسّر ہے۔ ان متضاد مناظر کو دیکھ کر شاعر کچھ سوچ میں پڑ جاتا ہے:

بدل کر بھی دنیا بدلتی نہیں ہے
محل میری جاں یوں ہی بنتے رہے ہیں

پہلی تصویر غریبی اور مفلسی کی پیش کرکے شاعر نے اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ ہر انسان فطرت سے غریب ہی پیدا ہوتا ہے، بچہ ایک مفلس کا اور بچّہ ایک سلطان کا ایک ہی طرح کا ہوتا ہے، انسان کا پہلا تجربہ ناداری ہی ہے، اس کے بعد انسان اپنی محنت سے، اپنی عقل سے، اپنی تہذیب کی بدولت دولت سمیٹنے لگا اور رفتہ رفتہ فطرت کے ان دو شاہکاروں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج بن گیا۔

اس نظم میں یہ بات تھوڑی کھٹکتی ہے کہ شاعر نے مفلس بچّوں اور عورتوں کی

تصویر ایسی پیش کی ہے کہ ان سے خواہ مخواہ کی نفرت پیدا ہو جائے اور امراء کے بچوں اور امیر عورتوں کی ایسی صورت دکھائی گئی ہے جس پر فرشتے بھی مائل ہو جائیں۔ حالانکہ فطرت کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ مگر اس نظم میں اس کا اشارہ گویا نہیں ہے اور غریبی کے جوہر پر نظر نہیں، بلکہ غریبوں کے عیوب پر نگاہ اٹھ جاتی ہے۔ اس طرح اس میں متوازن خلوص کی کمی کھٹکتی ہے۔ یہ نظم سراسر مقصدی ہے اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ جذبے سے نظم نہیں ہوئی، بلکہ نظم نے جذبے کی شکل اختیار کی ہے اور آورد، آمد کے ساتھ شیر و شکر نہیں ہو سکا۔

---

(۱۱) ان ۲۱۹ مصرعوں میں شاعر نے گذشتہ نظم کا جواب لکھا ہے۔ اس میں اشتراکی طریقۂ حیات پر غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ نظم نمبر ۱۰ میں سرمایہ داری اور تنگ دستی کے دو متبائن رجحانات کو زندگی کا تلازمہ بنا کر پیش کیا گیا تھا، جس میں ایک غیر متعلق شخص کا مشاہدۂ عسرت اور مشاہدۂ دولت دکھلایا گیا ہے۔ سرمایہ داری افلاس کے خون سے پل رہی ہے اور افلاس، سرمایہ داری کے پھینکے ہوئے چھیچھڑے پر زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ اُمراء و سلاطین کی دراز دستیاں اور غریبوں کی کوتاہ رسیاں آخر ختم ہو کر رہیں گی۔ یہی نظر یہ ہے، جو دراصل اشتراکیت کی روح ہے۔ مگر موجودہ اشتراکیت نے دولت کی ناہموار تقسیم کو یک لخت قابل لعنت قرار دیا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، حالانکہ دولت کی یہ نامساعد تقسیم بذات خود قابل نفرت نہیں۔ بلکہ دولت کے ان مالکوں کا تصور ناقابل عفو ہے، جو سارے اموال کو نعمت نہ سمجھ کر اپنی کمائی ہوئی دولت سمجھ بیٹھے ہیں، اشتراکیت

کا تنومند تصوّر یہی ہے۔ یہی ہے اسلامی اشتراکیت کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (تاکہ تم میں جو مال دار ہیں، وہ دولت نہ سمیٹ سکیں) اسلام میں سب سے پہلے اس قسم کا خیال حضرت ابوذر غفاریؓ نے ظاہر کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مال جمع کرنا اور دولت سمیٹنا اسلام کے اوامر کی خلاف ورزی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جب کبھی سلاطین کی قہرمانیاں حد سے فزوں ہوئی ہیں، دولت و ثروت کے ان ٹھیکہ داروں کے خلاف ایک تحریک اٹھائی گئی ہے، ہندوستان میں بھی یہی ہوا ہے، انگلی سرکار نے اُجلے نوابوں کی ایک ایسی جماعت بنا ڈالی، جس نے غریبوں کا لہو چوس کر دولت سمیٹنا اپنا فرض منصبی جان لیا۔ جیسے جیسے انسان مجبور اور بیوا انسان نے اپنے کو اس طرح کی زنجیروں میں کستے ہوئے محسوس کیا، اس نے آواز بلند کی۔ ایسے ملک میں جہاں قدرت نے غیر متوازن طور پر اپنے خزانے یا مال کئے ہیں، امارت و غربت کا فرق اور بھی شدید ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غریبی حقیقت میں انسان کی توہین ہے، اگرچہ یہ انسانیت کو چمکنے کا موقع بھی دیتی ہے اور امارت انسان کی معراج ہے۔ مگر انسانیت اکثر دولت کے بوجھ تلے پس جاتی ہے۔ اشتراکی حضرات انسان کی عظمت کے تو قائل ہوئے مگر انسان کی عظمت برقرار رکھنے کے لئے جو قوانین فطرت ہیں، ان سے منحرف ہونے لگے، انسان کو پیدا کرنے والی ذات سے بیزاری اور اس کے بتائے ہوئے راستہ سے کترانے کی تلقین سے انسان کو عظمت حاصل نہ ہوگی۔ اور اگر حاصل ہوئی بھی تو برقرار نہیں رہ سکتی۔

اقبال نے بھی اس قبیل کی کئی نظمیں لکھی ہیں، بلکہ انھوں نے تو لینن

عنوان پسند کرے۔ گرچہ کوئی تاثر ہمہ گیر اور شاعر کے خیالات و جذبات کا مکمل عکس نہ ہو سکے گا۔ وجہ کچھ بھی ہو، انھوں نے عنوان نہ دے کر اپنی نظموں کو ابتدا ہی میں ایک انوکھے انداز کی حامل بنا کر پیش کیا ہے۔ پہلی نظم جس بیچاری کا شمار اصل کتاب میں نہیں ہے، وہ صرف مقدمہ یا تمہید کے طور پر کوئی پیش لفظ نہیں ہے۔ اس لئے کہ دستور کے مطابق مقدمہ یا پیش لفظ کے پہلے فہرس مضامین دے دی جاتی ہے اور مقدمہ یا دیباچہ کے بعد کتاب شروع ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب یہ ہے کہ اس نظم کے بعد فہرست دی گئی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ارباب قلم بغیر کسی پیش لفظ یا دیباچہ کے آمدم بر سر مطلب کہہ ڈالتے ہیں۔ ایسا نفسیاتی طور پر وہ ادیب کرتے ہیں، جو اپنی نمائش سے بہر نوع رکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ادبا شاید اس کے قائل ہیں کہ 'کہیئے کلام اچھا ہوگا تو ہم کو ملتفت کرے گا'، لاریب کلیم صاحب کی طبیعت کچھ اسی انداز کی واقع ہوئی ہے۔ وہ ایسی کوئی بات اپنی زبان سے نہیں کہتے جس سے ان کی اپنی بڑائی ظاہر ہو۔ حالانکہ یہ طریقہ ایک طرح کا اخفائے حقیقت ہے۔

یہ سوچنے کا مقام ہے کہ پھر یہ نظم کس حیثیت سے بغیر شمار کے رکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم انتساب کے طور پر آئی ہے۔ اردو شاعری پر ایک نظر کے پہلے اڈیشن میں یہ کتاب مرحومہ حنیفہ بیگم کے نام معنون تھی اور دوسرے اڈیشن میں انتساب غائب ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ کتاب مرحومہ کے نام منتسب ہو۔ انتساب کا یہ طریقہ رومانی اور منفرد ہے۔ اس لئے کہ انتساب کے ساتھ ساتھ یہ دیباچہ کا بھی کام دے رہا ہے۔

یہ نظم ذرا طویل ہے۔ ۱۶۸ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ جو ایک طرح کی خود کلامی ہے۔ جس سے وہ اس روح شاعری کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ان سے دور بہت دور ہوتے ہوئے

کو خدا کے حضور میں پیش کر کے بھی اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور اسی وجہ سے بعض کوتاہ بیں حضرات اقبال کو اشتراکی بھی کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ اقبال نے جس اشتراکیت کو سراہا ہے، وہ اسلامی اشتراکیت ہے، جہاں مذہب کے عقاید اور مذہب کے عوامل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں اشتراکیت تو مذہب سے مغائرت کا نام ہے لینن بس ازمرگ سے یہ عقدہ وا ہوتا ہے کہ جو شئی کہ کلیسا کی خرافات سمجھی گئی تھی وہ ایک حقیقت ہے اور

جو قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ؛ حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

گذشتہ نظم امیروں کے رنگین محل اور ان کی رنگین زندگی کا رنگین بیان تھا۔ یہ پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں پہلی والی نظم ختم ہوئی ہے۔ اس نظم میں امیر اور غریب کا ایک طرح کا مکالمہ ہے، جس کی ابتدا ایک نئے انداز سے کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ جو عرش پر بیٹھا مشق ناز کرتا ہے، آج بھی عرش معلیٰ پر جلوہ فگن ہے، اس کے اردگرد، آسمان پر جنت خیز نظارے ابل رہے ہیں ایک جواہر سے بھرا ہوا، جگمگاتا ہوا تاج بر سر خدا کے سامنے فرشتے حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔ وہ سب کے سب رکوع و خضوع میں تسبیح در دست، با ادب صف بستہ کھڑے ہیں۔ سامنے جنت میں شہد کی نہریں رواں ہیں، حوریں بناؤ سنگار کر کے محو گلگشت ہیں۔ یہ خدا کون ہے، یہ خدا وہی سرمایہ دار ہے۔ یہ دیکھ کر شاعر بے ساختہ سوال کر بیٹھتا ہے، کہ یہ بھی کسی جاگیردار کی جاگیر ہے کیا۔ جو عیش و عشرت کی ارزانی اور نور و سرور کی فراوانی قدم لے رہی ہے۔ جاگیر کا لفظ منہ سے نکلنا تھا کہ شاعر کا خیال دوسری طرف مڑ جاتا ہے —— اے خدائے لم یزل اپنی شاہکار تخلیق کا حال تو معلوم کر لے، ذرا نیچے جھانک

کے تو دیکھ، کہ تیرے نائب کی کیا درگت بن رہی ہے۔ دھرتی پر رہنے والوں نے کیا اودھم مچا رکھی ہے۔ انسان نوع انساں کا شکاری بن گیا ہے۔ ایک نے اپنا خون پسینہ بنایا تو گاڑھے پسینے کی کمائی اس کو نہ ملی۔ بلکہ وہ تو مخملی گدوں پر سونے والے اڑا لے گئے؛ بیچارہ نادار، بھوک کی جلن سے جلا جاتا ہے، اپنا پیٹ پالنے کے لئے وہ لاکھ جتن کرتا ہے۔ اس کے لئے قید ہوتا ہے، سولی پر چڑھتا ہے، ننگ و ناموس بیچتا ہے:

دیکھو یہ کف پا میں
کیا خار کھٹکتے ہیں
کیسے یہ پھپھولے ہیں
کیا خون ٹپکتا ہے
کیا پیپ سی رستی ہے

دھرتی کے نیچے قارون کے جو خزانے ہیں، دھرتی نے ان کو ان امراء کے لئے اگل دیا ہے اور اپنی ساکھ اور اپنی خدائی قائم رکھنے کے لئے بیچارے غریبوں کو مذہب اخلاق، خدا کی مصلحت اور تقدیر پر صابر و شاکر ہونے کی تلقین کیجاتی ہے اور اس طرح بیچارے غریبوں کو، پھندے میں پھساتے ہیں، ان کاخہائے انجم کے رہنے والوں نے اپنے ایوان مرمر کے پتھر سے سجائے ہیں، بہشتی باغ لگا ہیں، لیکن:

مزدوروں کی محنت کے
یہ سارے کرشمے ہیں
ہاں ان کے پسینوں کے

موتی یہ جھلکتے ہیں

بیچارہ غریب تو اپنی حیات کی ساری رونق امراء کی زینت زیست کے لئے وقف کر چکا ہے، وہ اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہے، اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ اب وہ ایک جسم بے جان بے ایک ہڈی کا فریم ہے۔

سنسان اب آنکھیں ہیں
سنسان دل و جاں ہیں
ویرانہ ہے ویرانہ

غریبوں کو بہلانے پھسلانے کے لئے قناعت و صبر کی تلقین کا جال بچھایا جاتا ہے، ان کو جنت کی آسودگی اور فراوانی کا حرص دلایا جاتا ہے دولت، دولت تو ایمان کی دشمن ہے، جان کی دشمن ہے اور مجبور انسان کی دشمن ہے، اس لئے مجبوروں کو اس دشمن سے محترز رہنا چاہیئے اور فقر فقر تو میری و سلطانی سے بڑھ کر ہے، جنت غربا کے لئے بنائی گئی ہے۔ وہ دیکھو:

کیا نور کے چشمے ہیں
کیا طور کے شعلے ہیں

جنت میں ان کی جگہ مقرر ہے، وہ زمین پر نہیں آسمان پر حکومت کریں گے۔

یہ ساری شہنشاہی
لو دیکھو تمہاری ہے
جبریل تمہارا ہے
یزداں بھی تمہارا ہے

مگر اب مزدور جاگ گیا ہے، اب غریب اپنی حیات کی قدر و قیمت سے واقف ہو چکا ہے۔ اب غریب اُمرا کی بیدست و پائی کو سمجھ چکا ہے، وہ ان رنگین خیالوں سے مطمئن نہیں ہونے والا ہے، وہ اُمراء کو اسی دنیا میں حور و قصور پاتے ہوئے دیکھ کر صرف وعدہ حور پر اکتفا کرنے والا نہیں۔ جلے ہوئے دل سے جلی کٹی آواز آجاتی ہے:

جنت میں رکھا کیا ہے؟
یہ حوریں پُرانی ہیں
اس عرشِ معلّیٰ کی
بنیاد پرانی ہے

یہ یزداں کی مسلسل کم التفاتی پر ایک شکوہ آمیز طنز ہے، مقصود حور و قصور کا انکار نہیں، ہاں یہ سوال کرنا ضرور مقصود ہے کہ ہم اگر تیرے نائب ہیں، تو کیوں دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں، اس دنیا میں تو ہم نائب بنا کر بھیجے گئے تھے۔

ایک دن جلد ہی ایسا آنے والا ہے کہ ساری بساطِ ثروت اُلٹ دی جائے گی، وہ حشر خیز صدائے ماتم برپا ہو گی کہ عشرت کے سمن زار اور دولت کے حصار ٹوٹ پڑ کر گر جائیں گے، ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے، ہر کمال کو زوال لازم ہے۔ استبداد کا کمال ہی استبداد کے زوال کی دلیل ہے۔ یہی وقت کا اشارہ ہے اور تاریخ کا تقاضہ، اب دنیا نئے سرے سے سنواری جائے گی، نئے انداز ہوں گے۔ انسانیت کی بہبود کے پیغام بھی نئے ہوں گے، اب انسان بھی نئے ہوں گے ورنہ "نقش گر ازل ترا، نقش ہے ناتمام ابھی"، قرآن نئے ہوں گے، سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ واقعی کوئی دوسرا قرآن آئے گا

مقصد یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کو جو دل سے محو کر دیا گیا ہے، یا اس کی تفسیر فرسودہ طور پر کی جاتی رہی ہے، اب نئے سر سے مطالب سمجھ میں آئیں گے۔ ملائے مسجد نے قرآن کو دام تزویر بنا دیا ہے اور روح قرآن کو اپنی خواہشوں کے ملبے میں چھپا دیا ہے: ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

”قرآن کے اعتبار سے دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول ناقابل تسلیم ہیں، جن میں احتکار و اکتناز کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت و کنز پھیلے ہوئے ہونے کے بجائے سمٹ کر خاص حلقوں میں محدود ہو جائے۔“ (اسلام کا اقتصادی نظام از ڈاکٹر حفظ الرحمٰن) سورہ توبہ، سورہ حشر، سورۂ منافقون اور سورہ بقرہ میں ایسی آیتیں شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ دولت کو کس طرح ایک جگہ سمٹنے سے روکنے کا حکم دیتا ہے، کہ اسی سے انسان کی عظمت و نیابت الٰہی باقی رہ سکتی ہے:

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ — دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا

---

(۱۲) ۱۳۱ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم ہمیں انسان اور فطرت کے باہمی رشتوں کا پتہ دیتی ہے، آئینہ کائنات پر انسانوں کی معصومیت اور وحشت اور تہذیب نے کیسے کیسے اثرات ڈالے ہیں، ان سے واقف کراتی ہے۔ یہاں تین آئینے

لائے گئے ہیں اور تینوں میں فطرت و قدرت کا عکس دکھلایا گیا ہے۔ پہلا آئینہ ہمارے سامنے ابتدائی دور کے بہجت و سرور کو آئینہ کرتا ہے۔ جبکہ فطرت اپنی ساری فیاضیوں کے ساتھ زر و جواہر کے خزانے لٹا رہی تھی اور ہر منظر قدرت سے اطمینان اور آسودگی نمایاں تھی۔ یہ زمین لالہ زار بنی ہوئی تھی، چاروں طرف سبزے اپنے دامن پھیلائے ہوئے نعمت خداوندی سمیٹ رہے تھے، آسمان، چاند تاروں کو گود میں لئے ہوئے نور کی بارش میں مصروف تھا اور فطرت اپنی ساری عریانی کے ساتھ انسان کی خدمت میں محو تھی کہ انسانوں کی بڑھتی ہوئی خواہشوں نے ایک کو دوسرے سے نفرت کرنا سکھایا' ہر طرف وحشت، دہشت، قہر، ظلم، جبر و تشدّد، عناد نمودار ہونے لگے، حضرت موسیٰ ؑ کے دور میں جانے کتنے فرعون یکبارگی وجود میں آگئے تھے۔ یہ متخالف عناصر سے بنایا ہوا انسان کسی ایک حال پر صبر کرنے والا تو تھا نہیں، آپس میں اس کا تصادم بھی ضرور تھا اور تصادم کی تحریک کا باعث بقا کی خواہش ہے۔ اسی خواہش بقا نے ظالم اور وحشی، تتّار اور شدّاد کی شکل اختیار کر لی اور کائنات کا سکون درہم برہم ہوگیا:

ہاتھ سے آئینہ تو چھوٹ گیا
شیشہ تھا، ٹوٹ گیا، چھوٹ گیا

پہلا دور قہر و غضب کا تھا، تو دوسرا آئینہ رحم و رحمت کا سامنے آتا ہے۔ اسی قہر کے سینے سے رحم کی کرن پھوٹنے لگی، جس سے امن نکھرتا ہوا نظر آیا اور ہر چیز سرتاپا رحم و مسرت کا نمونہ بن گئی۔ حضرت عیسیٰ ؑ آئے اور ظلم و قہر کے اس دور عروج میں یہ تعلیم دی گئی کہ اگر کوئی شخص ایک گال میں تھپڑ مارے تو تم دوسرا

گال بھی بڑھا دو" رحمت و رافت کی یہ تلقین موسوی دور کے قہر و غضب کو کہ اگر کوئی تمہاری ایک آنکھ کو پھوڑے، تو تم اس کی دونوں آنکھوں کو پھوڑ دو۔ رفتہ رفتہ نرمی اور عفو و درگزر میں تحلیل کرنے لگی اور اس تحلیل میں کامیاب بھی ہوئی ـــ لیکن انسان کسی ایک حال پر قرار پانے والا تو ہے نہیں یہ عفو درگزر اور رحم و کرم اس کی فطرت کے خلاف تھی، اس لئے عیسوی تہاذیب آپس میں تہذیبی، سماجی اور سیاسی غرض ہر محاذ پر ٹکرانے لگی، وہی حضرات جو رحم و رحمت کے اسقف اعظم تھے، اپنے ہاتھوں کو معصوم خون سے دھونے لگے:

تو اسی رحم سے تلوار بنی
جان لیوا یہ ستمگار بنی

مرور ایام کے ساتھ رحمت تثلیث کے ماننے والوں نے ساری دنیا پر ظلم و ستم، بغض و عداوت کے جال بچھا دیئے، الفت، نفرت سے بدل گئی اور یہی نفرت ان کی فطرت ہو گئی۔ حضرت عیسیٰؑ کو سراپائے محبت ماننے والے کس طرح اسپین میں قتل و غارت گری کا ننگا ناچ دکھا گئے۔ سوچئے اور اس پر افسوس کیجئے۔ اور آج بھی وہ کیا کر رہے ہیں، دیکھئے اور ہاتھ ملتے رہیئے ـ

تیسرا آئینہ، مستقبل کا آئینہ ہے، جو حال کی برہمی کا مصور بھی ہے اور حال کی برتری کا عکاس بھی۔ اس آئینہ میں پھر وہی سکون، وہی فرحت، وہی قدرت کے کرشمے، وہی اطمینان اور مسرت کے کارخانے نظر آتے ہیں ـ

آئینہ سے مراد نگارخانۂ فطرت ہے اور رعنائی مظاہر قدرت ہے، اس لئے کہ فطرت اور قدرت ہی انسان کے اعمال و اقوال سے پہلے متاثر ہوتی ہے اور ان کا عکس ساری کائنات پر بکھرتی ہے، ان میں کا ہر آئینہ مظہر ذات خدا ہے۔ خداوند عالم

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

نے انسان کو انسان بنانے کے لئے تین آئینے بنائے، یعنی تین طرح کے تجربے کئے، پہلا تجربہ سراسر خست و فساد تشدد تھا، شقاوت و بغاوت کا تھا، قہر اور جبر کا تھا، مگر یہ تعلیم ہر انسان کی سرشت کے موافق نہ تھی اور نہ ہی جماعتی حیثیت سے یہ طریقہ، فکرِ اجتماعی فلاح و بہبود کا ضامن ہو سکتا تھا کہ انسان بلکہ ساری کائنات شر کا مظہر برابر تو نہیں رہ سکتی، شر محض کے بعد خیر محض کا تجربہ کیا گیا، عفو اور رحم انسان کی ترقی کی علامت ٹھہرائی گئی لیکن برابر رحم و رحمت اور معافی بھی انسان کو بے باک، شوخ اور گونہ بے حیا بنا دیتی ہے، وہ ہر رحمت و رافت کو انسان کی کمزوری پر محمول کرنے لگا، اس بے عملی اور پر سکون زندگی سے انسان جلد ہی اکتا گیا اور منفیانہ عناصر کے تقاضوں کے آگے سپر ڈال دی، شر و فساد بڑھنے لگے، رشک و عناد کا عروج ہوا، آبادیاں برباد ہونے لگیں، ایک دوسرے کے خون میں نہانے لگے، پہلے آپس میں خون خرابہ کرتے رہے، دھیرے دھیرے سارے ملک میں:

کیسی الفت نے بنائی نفرت
جاں سپاری گئی اُبھری شدت

یہ آئینہ انسان کے کام کا نہ رہا، خداوند قدوس کا مقصد ان مذاہب کے بھیجنے سے یہی تھا کہ انسان اللہ کا سچا اور پکا نائب بن کر زمین پر آئے، پہلے تجربہ میں اللہ تعالیٰ نے قہاریت کو نمائندگی عطا کی، قہاریت و جبروتیت نمائندگی کرنے سے قاصر رہی، دوسرے تجربہ میں رحمٰن اور رحیم کو خلافت ملی، عفو و رحم بھی نمائندگی نہ کر سکے، اب تیسرا آئینہ آتا ہے، جو عیسوی آئینہ کے لئے ضرور مستقبل کا آئینہ تھا، وہ آئینہ ہے عدل و انصاف کا، توازن و تفاہم کا، جہاں یہ تجربہ

عکس ریز ہوتا ہے کہ انسان خیر و شر دونوں ہی کا مجموعہ ہے، اس کے جذبہ شر کو رحم و رحمت اور خشیت ایزدی سے تربیت دیتا ہے (Discipline) قہر کا جواب قہر ہے، سختی کا جواب سختی، آنکھ کے بدلے آنکھ ہے۔ لیکن اگر معاف کردو تو اچھا ہے۔ بدلہ لینے کی اجازت ہے مگر انتقام میں عدل و توازن کی بنیادی شرط ہے اور اس پر عفو و درگذر کا غازہ مل دیا گیا ہے۔ یہ آئینہ مستقبل قطعاً ہر طبیعت کے انسان کے لئے رخشاں و درخشاں رہے گا۔ یہاں رحم و کرم کو کمزوری اور بے مائگی پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور انتقام کو ذاتی پرخاش اور جماعتی نفرت کی پیداوار نہیں بتایا جا سکتا۔

تیسرا آئینہ جو مستقبل کا آئینہ ہے، اس انداز سے پیش ہوا ہے کہ کسی طرح کی عصبیت کا شائبہ نہیں، حالات نے خود ہی ایسا رخ کیا کہ مستقبل کا آئینہ قہر و رحم کا مجموعہ ہو۔ جس پر عفو و درگذر کی جلا کی گئی ہو، یہ مستقبل کا آئینہ جہاں ملے۔ فطرت اس میں اپنے نکھار کو دیکھ سکتی ہے بلکہ فطرت کو بار دگر بننے، سنورنے کی ہمت ہو سکتی ہے، شاعر نے تیسرے تجربہ کی ناگزیری اور اس کی ناگزیر پذیرائی کس بالغانہ انداز میں بیان کی ہے، غور کیجئے کہ یہ تبلیغ و تلقین کا کیسا گہرا وار ہے:

دل کا آئینہ ذرا ہاتھ میں لو
آؤ آرائش کا کل کر لو
زلف پر خم کو ذرا خم کر لو
حسن کو اپنے چراغاں کر دو
شعلۂ طور کو سوزاں کر دو